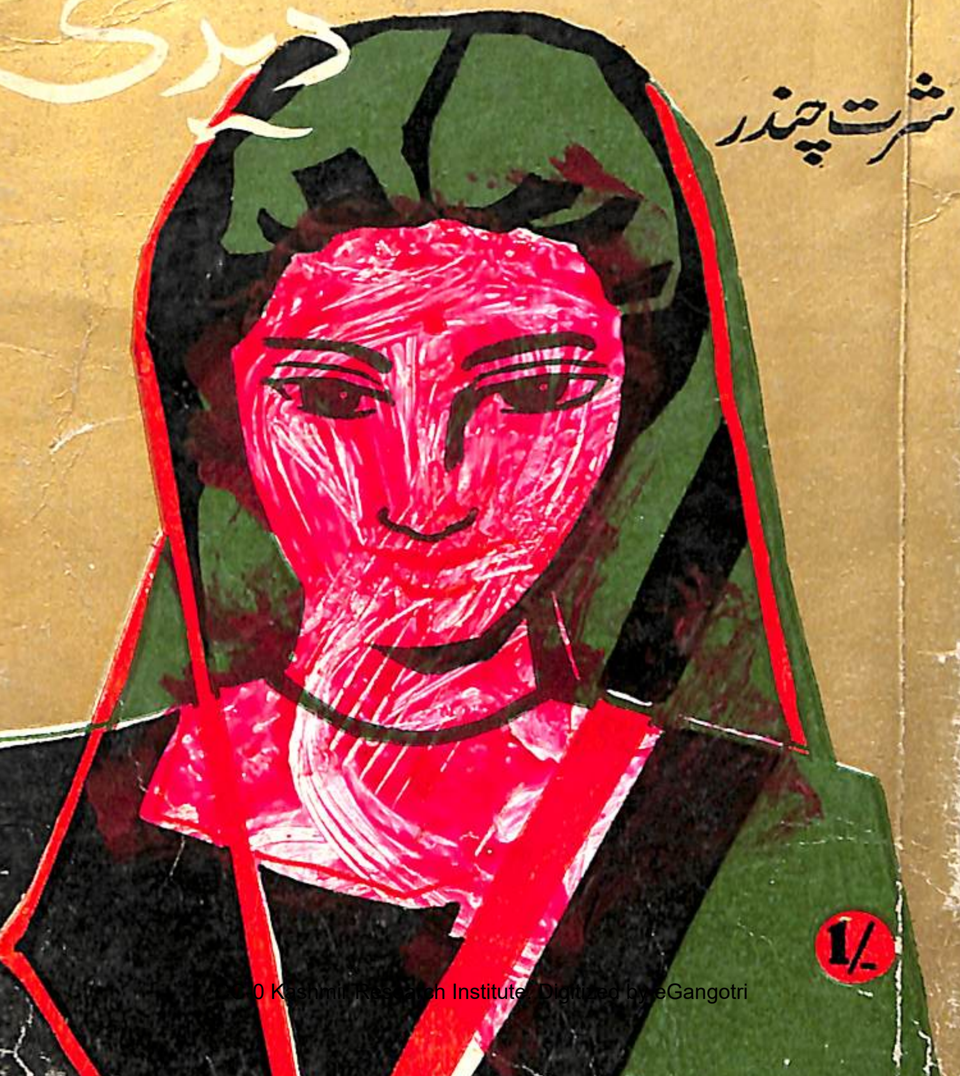
بڑی دیدی

شرت چندر



1/-

چند لفظوں میں

یہ ایک نوجوان بیوہ کی کہانی ہے جو کہ ایک سادہ دِل نوجوان پر فریفتہ ہو گئی تھی، لیکن وُہ پھسلتے پھسلتے بچ گئی۔ اور وہ سادہ دِل نوجوان جو کہ اُس کو ایک دیوی کی طرح پُوجتا تھا اُس کے لئے اپنی جان پر کھیل گیا شرت چندر کا یہ انوکھا اور دلچسپ ناول آپ ایک بار شروع کر کے بغیر ختم کئے نہ چھوڑیں گے۔

مشورہ پاکٹ بکس میں شائع ہونے والے تمام
کردار مقامات و واقعات فرضی ہیں اور ان کا
کسی شخص، جگہ، واقعہ یا ادارے سے کوئی تعلق نہیں
ہے۔ کسی فرد مقام یا ادارے سے مطابقت قطعی
اتفاقیہ ہے۔ اور اس کے لیے مصنف یا پبلشرز
کسی طرح کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتے

عام فہم اردو زبان میں مشہور و معروف ناولوں کے لاجواب
اور معرکۃ الآرا شاہکار نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کرنیوالا ادارہ
مشورہ بک ڈپو۔ رام نگر گاندھی نگر پوسٹ بکس 1839 دہلی

شرت چندر

بڑی دیدی



ناشران
مشورہ بک ڈپو
رام نگر۔ گاندھی نگر۔ پوسٹ بکس 1639 دہلی

پہلا ایڈیشن ——— اپریل سنہ ۱۹۶۰ء



ناشران

مشورہ بک ڈپو

رام نگر۔ گاندھی نگر۔ پوسٹ بکس 639 دہلی ۶

قیمت فی کتاب صرف ایک روپیہ

(الجمعیۃ پریس دہلی)

دُنیا میں لوگوں کا ایک ایسا گروہ ہے جسے پھوس کی آگ کہہ سکتے ہیں فوراً
ہی وہ جل اُٹھتے ہیں اور جلدی ہی بجھ بھی سکتے ہیں۔ اُنکے لئے ہر وقت ایک ایسے آدمی
کی ضرورت رہتی ہے جو بوقت ضرورت پھوس ڈالتا رہے۔ اُنہیں بھڑکاتا رہے۔

گھروں میں بہو بیٹیاں مٹی کا دیا سجاتے وقت جیسے اُس میں تیل اور بتی ڈالتی
ہیں ویسے ہی اُس میں ایک تیلی بھی رکھ دیتی ہیں۔ دیپک کی لَو گھٹنے لگتی ہے۔ تب
اُس معمولی سی تیلی کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اُس سے بتی بڑھائی جاتی ہے
اُس کے بغیر تیل اور بتی موجود ہونے پر بھی دیپک مسلسل نہیں جل سکتا۔

سُریندر ناتھ کی عادت بھی کچھ اسی طرح کی تھی اُسمیں طاقت دماغ اعتماد سب کچھ
تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اکیلے ہی کچھ کام کرنے سے معذور تھا۔ کام کا کچھ حصہ تو وہ بڑے جوش
و خروش سے کرتا لیکن باقی ماندہ کام سستی اور لاپرواہی کیوجہ سے چھوڑ کر چپ چاپ
بیٹھ جاتا۔ اُسوقت ایک ایسی ہستی کی ضرورت ہوتی جو اُسے کام کرنیکی ترغیب دے اور اُکسائے۔

بنگال سے بہت دور یوپی کے ایک شہر میں سُریندر کے والد وکالت کرتے تھے۔
بنگال کے ساتھ اُنکا کوئی تعلق نہ تھا۔ اُس شہر میں بیس سال کی عمر میں ایم اے کی ڈگری
حاصل کر لی تھی۔ اُسمیں کچھ تو اُسکی اپنی لیاقت شامل تھی اور کچھ اُسمیں سوتیلی ماں
کا ہاتھ تھا۔ وہ سوتیلی ماں جس پیار اور لگن سے اُسکی دیکھ بھال کرتی تھی اُس سے ایسا
جیسے اُسکی اپنی کچھ اہمیت ہی نہیں اور سُریندر نام کی کوئی ہستی اِس دُنیا میں نہیں سوتیلی
ماں کی تمنائیں ایک انسان کے روپ میں کام کاج کرتیں، سوتی بیٹھتی، پڑھتی لکھتی
امتحان دیتیں اور پاس ہوتی تھیں۔ یہ کہنا ٹھیک ہوگا۔ یہ سوتیلی ماں اپنے پیٹ کے
لڑکے کے تئیں کچھ لاپرواہ ہونے پر بھی سُریندر کی دیکھ بھال میں رتی بھر بھی فرق نہ

آنے دیتی تھی۔ سُریندر کی دیکھ بھال کی کوئی انتہا نہ تھی۔ سُریندر کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اُسکی نظروں سے چھُپ نہ سکتا تھا۔ اِس بااصول عورت کی زیرِ شفقت اور زیرِ سایہ رہ کر سُریندر نے لکھنا پڑھنا تو سیکھ لیا لیکن خود اعتمادی اور خود پروری سے کوسوں دُور رہا۔ اُسے اپنی ذات پر اور اپنی طاقت پر ذرا بھر بھی بھروسہ نہ تھا۔ وُہ یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اکیلے میں نہ کوئی کام پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ کِس وقت اُسے کِس چیز کی ضرورت ہو گی اور کِس وقت اُسے کیا کرنا ہو گا؟ یہ سب ٹھیک کرنے کی ذمہ داری مکمل طور پر کسی دوسرے آدمی پر ڈالے رکھتا تھا۔ نیند محسوس ہو رہی ہے یا بھوک لگی ہے۔ یہ بھی وُہ اکثر نہ سمجھ پاتا تھا۔

جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا تب سے ہی سوتیلی ماں کے سہارے رہ کر اُس نے پندرہ سال گزار دیئے تھے۔ اِسی وجہ سے سوتیلی ماں کو اِس بیٹے کے پیار، غصہ، بھڑکنے، ڈپٹنے، اور مُنہ بنانے میں چوبیس گھنٹوں میں بائیس گھنٹے بِتانے پڑتے تھے۔ علاوہ ازیں جس سال سُریندر کو امتحان دینا ہوتا اُسی سال ہی سے اُسے رات رات بھر جگانے کیلئے بیچاری ماں کو بھی رات کی راحت افزا نیند سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ سوت کے لڑکے کیلئے کون عورت اِتنا کر سکتی ہے؟ سب آڑوسی پڑوسی اِسی وجہ سے رائے بابو کی بیوی کی تعریف کرتے تھے۔

سُریندر کیلئے سوتیلی ماں کے دِل میں پیار اور لگن میں رتی بھر بھی کمی نہ ہونے پاتی تھی۔ جب کبھی اُسکی سوتیلی ماں بیٹے کو جھڑکتی یا ڈانٹتی اس پر بیٹے کا چہرہ تمتما اُٹھتا اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے تو اُسے بُخار کا پیش خیمہ سمجھ کر وُہ بیٹے کو تین دِن لگاتار صرف ساگو دانہ کھلانے سے کبھی نہ چُوکتی تھی۔ بیٹے کی تعلیم و تربیت کے بارے میں تو اُسکی نظر اور بھی تیکھی تھی۔ اگر کبھی سُریندر کے جسم پر اچھے اور ماڈرن قسم کے فیشن ایبل کپڑے دیکھ لیتی تو لڑکے کی شوقینی اور بابو بننے کی تمنا کو فوراً اُتار جاتی۔ اور پھر اُسی دم دو تین ہفتوں کیلئے کپڑے نکال دھوبی کے گھر جانا بند کر دیتی

اِسی طرح سُریندر کے دِن بیت رہے تھے۔ ایسی پیار بھری مگر کڑی نگرانی میں رہتے ہوئے کبھی کبھی سُریندر کو محسوس ہوتا جیسے اُسکی زندگی، زندگی کہلانے کی مستحق نہیں۔ کبھی وہ سوچتا شاید ہر [illegible]

اُس کے ذہن میں کچھ دوسری ہی نوعیت کی باتیں ٹھونس جاتے تھے۔

ایکدن ایسا ہی ہوا۔ ایک دوست نے سُریندر کو مشورہ دیا کہ اُس جیسا لائق لڑکا ولایت جاسکے تو مستقبل میں بڑی ترقی کی اُمید کیجا سکتی ہے۔ اپنے ملک میں واپس آکر وہ لوگوں کی بہت اچھی طرح سے خدمت کر سکتا ہے۔ یہ بات سُریندر کے من کو بھی جچ گئی جنگلی چڑیا کے برعکس قفس میں مقید چڑیا ہی زیادہ چھٹپٹاتی ہے۔ سُریندر تصورات کی دُنیا میں پہنچ گیا جہاں کھلی ہوا اور آزادی تھی۔ اُس کا بیقرار دل قیدی پرندے کی مانند آزاد ہونے کیلئے قفس میں چھٹپٹاتا ہوا چکر کاٹنے لگا۔

سُریندر نے پتا کے پاس جا کر التجا کی کہ مجھے ولایت بھیجنے کا انتظام کر دیجئے۔ ولائیت کا سفر کرنے سے جو ترقی کی اُمید اُس نے سُنی تھی وہ بھی اُس نے پتا کے گوش گزار کر دی۔ پتا نے کہا "سوچونگا"۔ لیکن بیوی کی رائے ایک دم اُس کے خلاف پائی گئی۔ وہ باپ بیٹے کے درمیاں آندھی کی مانند آکر اس زور سے گرجی کہ دونوں سناٹے میں آ گئے۔

اُس نے کہا: "تو پھر مجھے بھی ولائیت بھیجدیں نہیں تو وہاں سُریندر کی دیکھ بھال کون کریگا؟ جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ کسوقت کیا کھانا ہے؟ کسوقت کیا کرنا ہے؟ اُسے اکیلے ہی ولائیت بھیج رہے ہو؟ اسکو بھیجنا گھر کے گھوڑے کو بھیجنے کے برابر ہے۔ کیونکہ جانور وغیرہ اتنا تو سمجھ لیتے ہیں کہ انہیں بھوک لگی ہے یا نیند محسوس ہو رہی۔ تمہارے لڑکے کو تو اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا"۔ اتنا کہہ کر وہ طنزیہ ہنسنے لگی۔

بیوی کو اس طرح ہنستے ہوئے دیکھ کر راے بابو بہت شرمندہ ہوئے۔ سُریندر نے بھی محسوس کیا کہ اس طرح کی بہادر اور بیخوف عورت کی مخالفت کرنا اُسکے بس کی بات نہیں۔ اُس نے ولایت جانیکی اُمید چھوڑ دی۔ اُسکے اُسی دوست نے یہ خبر سُنکر بڑے دُکھ کا اظہار کیا۔ لیکن وہ بھی نہ بتلا سکا کہ ولائیت جانے کیلئے اور بھی کوئی راستہ ہو سکتا ہے۔ بات ختم ہوتے وقت اُس نے اتنا ضرور کہا کہ اسطرح کسی کا محتاج ہونے کی نسبت بھیک مانگ لینا بہتر ہے اور یہ تو یقینی امر ہے کہ جو تمہاری طرح اتنی عزت کے ساتھ ایم۔ اے کی ڈگری لے سکتا ہے۔ وہ کبھی بھی کسی جگہ بھی پیٹ بھر روٹی کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہو سکتا۔

سُریندر نے گھر پہنچکر اس مسئلہ پر سوچنا شروع کر دیا۔ وُہ جتنا ہی غور کرتا اُتنا ہی اُسے دوست کا یہ کہنا کہ "اِس سے بھیک مانگ کر کھانا بہتر ہے" ٹھیک محسُوس ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ سب لوگ ہی ولائیت نہیں جا پاتے۔ لیکن اُنہیں اِسطرح زندہ لاش بنکر زندگی نہیں گزارنی پڑتی

ایکدن زیادہ رات گئے سُریندر گھر سے چلدیا۔ اسٹیشن آکر اُس نے کلکتہ کا ٹکٹ خریدا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ پتا کے نام اُس نے ایک خط لکھ کر پوسٹ کر دیا۔ اُس میں یہی لکھا تھا کہ "کچھ دنوں کیلئے میں گھر چھوڑ کر جا رہا ہُوں۔ بیکار ڈھونڈنے سے کچھ نہ ہو گا۔ اور اگر میرا پتہ چل بھی جائے تو میرے گھر آنے کی اُمید نہ رکھئے گا۔"

رائے باپُو نے بیٹے کا یہ خط بیوی کو بھی دکھایا۔ اُنھوں نے کہا "سُریندر اب سمجھدار ہو گیا ہے۔ پڑھ لکھ چکا ہے۔ پر نکل آئے ہیں اگر اب بھی وُہ نہ بھاگتا تو اور کب بھاگے گا؟"
پھر بھی پتا نے کھوج لگانے میں سرتوڑ کوشش کی لیکن بے سُود۔ کلکتہ میں جان پہچان کے جتنے بھی لوگ تھے اُن سب کو خط بھیجے لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہُوا۔ سُریندر لا پتہ ہی

گھما گھمی اور شور وغُل سے کلکتہ کی سڑکیں گلزار رہتی ہیں۔ اُن سڑکوں پر پہنچتے ہی سُریندر ششدر رہ گیا۔ ایسی افراتفری میں سُریندر کو کوئی ساتھی نہ مل سکا۔ کوئی جھڑکنے اور بھگانے والا بھی نہ تھا۔ اور دن رات نگرانی کرنیوالا بھی کوئی نہ تھا۔ بھُوک، پیاس سے منہ سُوکھ جانے پر بھی کوئی اُسے گھُوم کر نہ دیکھتا تھا۔ اُداس ہونے پر بھی کوئی اُسکی طرف متوجہ نہ ہوتا۔ یہاں خُود ہی اپنی خبر گیری کرنی ہوتی ہے۔ آپ ہی اپنا دھیان رکھنا پڑتا ہے یہاں بھیک بھی مل سکتی ہے۔ پیار ملنے کی جگہ بھی ہیں۔ پناہ بھی ملجاتی ہے۔ لیکن کہیں اِن سب کیلئے کوشش اور سعی درکار ہے۔ اپنی مرضی سے کوئی خود تمہارے دُکھ میں شامل نہ ہو گا۔

یہاں اِس ماحول میں آکر سُریندر نے یہ سیکھا کہ کھانے کیلئے خود ہی جدّ وجہد کرنی ہوتی ہے رہنے کیلئے جگہ خود ہی تلاش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو جانے سے بھوک کی آتش ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ کھانا کھا لینے سے نیند کی خماری نہیں جاتی۔

گھر چھوڑے سُریندر کو کتنے ہی دِن ہو گئے۔ اَن گنت راہوں پر گھومنے سے اُسکا جسم بھی تھک کر چُور ہو گیا تھا اور پاس کا پیسہ بھی قریب الختم تھا۔ کپڑے میلے ہو کر پھٹنے بھی لگے تھے۔ رات کو پڑ کر سو رہنے بھر کو بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ سُریندر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گھر خط لکھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ شرم اور ہچکچاہٹ مانع تھی۔ سب سے بڑی رُکاوٹ یہ تھی کہ جب اُسکو سوتیلی ماں کا پیار بھرا چہرہ یاد آتا تب گھر جانے کی تمنا بجلی کے مانند غائب ہو جاتی۔

ایک دِن اپنے ہی جیسے غریب آدمی کو دیکھ کر سُریندر نے پُوچھا "بھائی صاحب آپ لوگ یہاں کیا دھندا کر کے کھاتے پیتے ہیں؟"

وہ آدمی کچھ سادہ لوح سا تھا۔ نہیں تو پوچھنے والے کا مذاق اُڑاتا۔ اُسنے بڑی سادگی سے جواب دیا۔" نوکری اور محنت مزدوری کر کے کماتے اور کھاتے ہیں۔ کلکتہ میں روزگار کی بھلا کیا کمی ہے ———؟"

سُریندر نے پُوچھا ——" کیا آپ مجھے بھی کہیں کام دِلوا سکتے ہیں۔؟"

اُس نے پُوچھا —— "تم کون سا کام جانتے ہو ——؟"

سُریندر کوئی کام کرنا نہیں جانتا تھا۔ گم سُم ہو کر سوچنے لگا۔

"کیا تم کسی بھلے گھر کے لڑکے ہو؟" اُس سادہ لوح اجنبی نے سوال کیا۔

سُریندر نے سر ہلا کر حامی بھر لی۔

"پھر تم پڑھے لکھے کیوں نہیں؟"

"میں پڑھا لکھا ہوں" سُریندر نے بتایا۔

اُس آدمی نے دم بھر سوچ کر کہا —" تو تم ابھی اِس بڑے مکان میں جاؤ۔ اُس میں ایک بڑے زمیندار رہتے ہیں وہ ضرور کچھ انتظام کر دینگے"۔ اِتنا کہکر وہ آگے بڑھ گیا۔

سُریندر اُس بڑے مکان کے پھاٹک کے قریب آیا اور ذرا ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر پیچھے ہٹ گیا پھر وہیں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر پیچھے لوٹ آیا۔ اُس دِن وُہ اِس لئے فیصلہ نہ کر سکا۔ دُوسرا دِن بھی اِسی طرح ہچکچاہٹ میں گزر گیا۔ وُہ دو دِن اسی طرح پھاٹک کے پاس پہنچکر ہچکچاہٹ میں گزارنے کے بعد تیسرے دِن ہمت کر کے سُریندر اندر چلا گیا۔ سامنے ایک نوکر کھڑا تھا۔ اُس نے پُوچھا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"زمیندار صاحب سے ملنا چاہتا ہوں"۔ سُریندر نے جواب دیا۔

"بابوجی ابھی گھر پر موجود نہیں ہیں"۔ نوکر نے بتایا۔

سُریندر کا دِل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ ایک بہت ہی پیچیدہ مسئلہ سے اُسے چھٹکارا مِل گیا۔ زمیندار صاحب گھر پر موجود نہیں ہیں۔ نوکری کی بابت کچھ نہ کہنا پڑا اور اپنی دُکھ بھری داستان نہیں سُنانی پڑی۔ یہی اُسکی خوشی کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ وُہ دُگنے جوش و خروش سے واپس لوٹ آیا اور حلوائی کی دُوکان میں بیٹھکر پیٹ بھر کھانے کے بعد بڑے مزے میں کچھ دیر گھومتا رہا۔ اور دِل ہی دِل میں سوچتا رہا کہ اگلے دِن کس طریقے سے بات چیت کیجائے جس سے کچھ ٹھکانہ بنجائے۔

لیکن دوسرے دِن اُس میں نہ وُہ جوش تھا نہ خروش۔ وُہ جسقدر اُس مکان کے نزدیک پہنچتا گیا۔ اُتنی ہی اُسکے دِل میں واپس لوٹ آنیکی تمنا زور پکڑتی گئی۔ پھاٹک کے ذرا نزدیک پہنچکر تو اُسکا دِل بالکل ہی بیٹھ گیا۔ پاؤں کسی شرط پر بھی اندر داخل ہونے کو تیار نہ ہوئے وُہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اُسے کوئی زبردستی اُسکی مرضی کے خلاف اندر دھکیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

لیکن پھاٹک پر کھڑے ہو کر انتظار کرنا وُہ مناسب نہ سمجھتا تھا اِسلئے اُسے اندر جانا ہی پڑا۔ اُسی نوکر سے پھر مُلاقات ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ بابو صاحب اِسوقت گھر میں موجود ہیں۔ "کیا مُلاقات کیجئے گا"۔ نوکر نے پُوچھا۔

"ہاں!" اُس نے جواب دیا۔

"تو پھر چلے آیئے"۔ نوکر نے کہا۔

یہ اور بھی مشکل مرحلہ تھا۔ زمیندار کا مکان بہت وسیع اور عالی شان تھا۔ پُورا

ضاجی ڈھنگ تھا۔ تمام مکان انگریزی سامان اور انگریزی ڈھنگ سے مزین تھا۔ کمروں کے بعد دوسرا کمرہ تھا۔ سنگ مرمر کی سیڑھیاں تھیں۔ ہر ایک کمرہ جھاڑ فانوس اور لال پردوں سے سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر فدا اور آئینے آویزاں تھے۔ کتنی ہی بیش قیمت تصویریں اور فوٹو لگی ہوئی تھیں۔ بھلے ہی یہ سجاوٹ کسی اور کیلئے حیرانی کا باعث ہو۔ لیکن سُریندر کیلئے قطعی نہ تھی۔ کیونکہ اُس کے والد کا گھر بھی کسی غریب کی کُٹیا نہ تھی۔ اور چاہے کچھ بھی ہو۔ لیکن یہ بات تو قابلِ اعتبار تھی کہ وہ کسی چھوٹے آدمی کی اولاد نہ تھا۔ سُریندر تو فقط اُسی ہستی کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ جس سے وہ ملاقات کرنے اور خوشامد کرنے جا رہا تھا۔ وہ کیا سوالات پوچھینگے اور اُسے کیا جوابات دینے ہوں گے۔

لیکن اب تو یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہ تھا۔ گھر کے مالک سامنے ہی بیٹھے تھے۔

"کیا کام ہے؟"

آج تین دن سے سُریندر یہی بات سوچ رہا تھا۔ لیکن یہاں آکر اُسکے حواس بیٹنا گو اور وہ بوکھلا سا گیا۔ ہکلاتے ہوئے کہنے لگا "مَیں۔ مَیں ——————!"

زمیندار کا نام برج ناتھ لاہری تھا۔ یہ بنگال کے ایک بڑے زمیندار تھے۔ سَر کے بال کھچڑی ہونے جا رہے تھے۔ نزلہ کی بیماری نہ تھی۔ عُمر کے مُطابق بالوں کا پکنا ٹھیک ہی تھا۔ بڑے آدمی ٹھہرے۔ جہاں دیدہ تھے۔ اسی لئے سُریندر کو ایک نظر دیکھتے ہی اسکے بارے میں سب کچھ سمجھ گئے۔ کہنے لگے۔ "ہاں جی! کیا چاہتے ہو تُم ——————؟"

"کوئی ایک ——————"

"کوئی ایک۔ کیا مطلب؟"

"نوکری ——————"

برج بابو نے ہنستے ہوئے کہا "یہ تُم سے کس نے بتایا کہ مَیں تمکو نوکری دے سکتا ہوں؟"

راستے میں ایک آدمی سے مُلاقات ہوئی تھی۔ مَیں نے اِس بارے میں پُوچھا تھا اُس نے آپ کا نام بتایا ——————"

"اچھا تمہارا گھر کہاں ہے؟ ——————"

"پنجاب میں ہے ——————"

"وہاں تمہارے کون کون لوگ رہتے ہیں ——————؟"

سُریندر نے سب کچھ بتا دیا۔

"تمہارے پتا کیا کام کرتے ہیں ——————؟"

وقت کے چکر میں پھنس کر سُریندر نے نیا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ ذرا رُک کر جواب دیا۔

"ایک معمولی سی نوکری کرتے ہیں ——————"

"اور اُسمیں گزارہ نہیں ہوتا۔ اسلئے تم نوکری کرنا چاہتے ہو۔ یہی بات ہے نا"

"جی ہاں ——————"

"یہاں کس جگہ ہو ——————؟"

"کوئی ایک جگہ نہیں ہے کہیں بھی پڑ رہتا ہوں ——————"

برج بابو کے دل میں رحم کا جذبہ اُمڈ آیا۔ سُریندر کو پاس بٹھلا کر کہنے لگے

"تم ابھی تک بچے ہی ہو۔ اس کچی عمر میں گھر چھوڑ کر یہاں آنے کیلئے مجبور ہوئے ہو۔ یہ سُنکر مجھے بڑا دُکھ ہوا ہے کہ میں بذاتِ خود تو تمہیں کوئی نوکری نہیں دے سکتا ہوں لیکن اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہاری نوکری کا کوئی نہ کوئی وسیلہ ضرور بن جائیگا۔"

"بہت بہت شکریہ" کہہ کر سُریندر جانے کو تیار ہوا۔ یہ دیکھ کر برج بابو نے کہا۔ "اس بارے میں کچھ اور پوچھنے کی کیا تمہیں ضرورت نہیں ہے ؟"

"جی نہیں ——————"

"کیا اتنے سے ہی تمہارا کام ٹھیک ہو جائیگا؟ تم نے یہ تو جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ میں کیا کر سکتا ہوں اور کب کر سکتا ہوں ——————؟"

سُریندر شرمندہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ برج بابو نے ہنسکر کہا۔ "اب یہاں سے کہاں جانے کا ارادہ ہے ——————؟"

"کسی حلوائی کی دُوکان پر جانے کا ــــــــــ"

"کیا وہیں ناشتہ کرو گے ــــــــــ؟"

"جی ہاں۔ روزانہ وہیں کرتا ہُوں ــــــــــ"

"تمہاری تعلیم کہاں تک ہے ــــــــــ؟"

"جی یُوہنی تھوڑا بہت جانتا ہُوں ــــــــــ"

"کیا میرے لڑکے کو پڑھا سکو گے ــــــــــ؟"

سُرِندر نے خوشی سے اُچھلتے ہُوئے کہا۔"جی ہاں پڑھا سکوُں گا ــــ"
برج بابُو پھر مسکرائے۔ سمجھے کہ شاید بھُوک اور افلاس سے اس لڑکے کے ہوش ٹھکانے نہیں رہے۔ کیونکہ کتنی عُمر کے لڑکے کو پڑھانا ہو گا۔ کیا پڑھانا ہو گا۔ یہ سب کُچھ معلوم کئے بغیر ہی اِس طرح بھولا نہ سمایا پاگلپن نہیں تو اور کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر وُہ لڑکا بی۔ اے میں پڑھتا ہو تو تُم اُسے کیسے پڑھا سکو گے ــــــ"

سُرِندر نے سنجیدگی سے سوچ کر جواب دیا۔"تو بھی میں کام چلاؤں گا۔"
برج بابُو نے مزید کُچھ نہ کہا۔ نوکر کو بُلا کر کہا۔"بابُو صاحب کے رہنے کیلئے ایک کمرہ خالی کر دو۔ اور ان کے نہانے اور کھانے کا بندوبست کر دو۔"
اِس کے بعد سُرِندر کی طرف دیکھ کر برج بابُو نے کہا۔"شام کے بعد میں تُم کو پھر بُلاؤں گا۔ تب تک تُم آرام سے یہیں میرے گھر میں رہو ــــــ"
دوپہر کو کھانا کھانے کیلئے اندر جا کر برج بابُو نے اپنی لڑکی مادھوی کو اپنے پاس بُلا کر کہا۔"بیٹی ایک دُکھی اور بے سہارا آدمی کو میں نے آج اپنے گھر میں پناہ دی ہے۔"

مادھوی نے پُوچھا۔"کون ہے بابُوجی ــــــ؟"
برج بابُو نے کہا۔"سوائے اسکے کہ وُہ ایک مُفلس اور دُکھی ہے میں اور کُچھ اُسکے بارے میں نہیں جانتا۔ ہاں کُچھ تعلیم یافتہ بھی ہے کیونکہ تُمھارے بڑے بھائی کو پڑھانے کی بات کہتے ہی اُس نے منظُور کر لیا۔ جو آدمی بی۔ اے کے طالب علم کو پڑھانے کی لیاقت رکھتا ہے وُہ کم

از کم تمہاری چھوٹی بہن کو ضرور پڑھا سکے گا۔ میں سوچتا ہوں اُسے پرمیلا کیلئے ماسٹر رکھ لیا جائے۔
مادھوی نے اس میں کچھ ہرج نہ سمجھا۔
شام کے بعد سُریندر کو بُلا کر برج بالو نے یہ بات کہی۔ دوسرے دن سے ہی سُریندر
پرمیلا کو پڑھانے لگا۔
پرمیلا سات سال کی لڑکی تھی۔ وہ گھر پر ہی پڑھتی تھی۔ اُس نے اپنی بڑی بہن
مادھوی سے انگریزی کی پہلی کتاب مینڈک کی کہانی تک پڑھی تھی۔ اپنی کاپی، کتاب، سلیٹ
اور قلم وغیرہ لاکر پرمیلا اپنے نئے ماسٹر کے پاس پڑھنے گئی۔
"ڈو ناٹ موو" سُریندر نے اُسے بتایا۔ "اس کے معنی ہوئے ہلو نہیں"۔
پرمیلا اسے بار بار رٹ کر یاد کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد سُریندر نے بے دلی سے سلیٹ کھینچ لی اور پنسل
سے مشکل سوالات حل کرنے لگا۔ اسی طرح سات آٹھ اور نو بجتے گئے۔ پرمیلا کبھی ادھر اور کبھی اُدھر
گھوم کر تصویر والے صفحے اُلٹا کر لیٹ کر بیٹھ کو کُہنہ میں انگریزی مٹھائی کی ٹکیہ رکھ کر بیچاری گم سُم
سی مینڈک کے سارے بدن میں سیاہی پوتتی ہوئی رٹتی جاتی تھی "Do not move ڈو۔ یعنی ہلو نہیں"
پرمیلا نے اُکتا کر کہا۔ "ماسٹر صاحب اب اندر جاؤں ــــــ؟"
"جاؤ" سُریندر نے مختصر سا جواب دیا۔
سُریندر کا صبح کا وقت اسی طرح گزرتا ہے لیکن دوپہر کے وقت کام کا ڈھنگ ذرا
مختلف ہے۔ نوکری لگا دینے کیلئے برج بالو نے کئی بھلے آدمیوں کے نام چٹھیاں لکھ دی تھیں
وہ چٹھیاں جیب میں رکھ کر سُریندر دوپہر کو نوکری کی تلاش میں نکل جاتا۔ پتہ لگانے لگاتے
لوگوں کے گھر پہنچ کر سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا۔ دیکھتا ــــ "کتنا عالی شان مکان ہے۔ کتنی کھڑکیاں
اور دروازے ہیں۔ کتنے کمرے ہیں۔ دو منزلہ ہے یا تین منزلہ دروازے کے آگے کوئی
لالٹین کا کھمبا ہے یا نہیں"۔ یوں گھوم پھر کر وہ شام سے پہلے ہی اپنے ڈیرے پر لوٹ آتا۔
کلکتہ میں آتے ہی سُریندر نے کتابیں خرید لی تھیں۔ کچھ گھر سے بھی ساتھ لے آیا
تھا۔ گیس کی روشنی میں انہیں پڑھا کرتا۔ برج بالو نوکری کے بارے میں پوچھتے تو وہ کہتا

تو خاموش رہتا یا کہہ دیتا "بڑے آدمی سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔"

برج بابو کی دھرم پتنی کو مرے ہوئے چار سال ہو گئے۔ بڑھاپے کے اس دُکھ کی شدت اور اہمیت کو وُہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جنھیں اس دُکھ سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ خیر چھوڑو اس بحث کو۔ برج بابو کی پیاری لڑکی مادھوی دیوی اس عُمر میں پتی کو گنوا چکی ہے۔ اسی دُکھ نے برج بابو کے جسم کا آدھے سے زیادہ خون چوس ڈالا ہے۔ اُنھوں نے بڑی دھوم دھام اور بڑے زور شور سے لڑکی کا بیاہ رچایا تھا۔ اپنے یہاں دولت کی افراط کے سبب، اُنھوں نے یہ تحقیقات نہ کی کہ مخالف پارٹی کا آدمی دولت مند ہے یا نہیں۔ اُنھوں نے لڑکے کی دولت زمین جائیداد نہ دیکھ کر اُسکی تعلیم، شکل، صورت، صحت اور اچھے کردار کو ہی اہمیت دی۔ یہ سب خصوصیات دیکھ کر ہی اُنھوں نے مادھوی کا بیاہ رچایا تھا۔

گیارہ سال کی چھوٹی سی عُمر میں ہی مادھوی کی شادی ہو گئی تھی۔ تین سال تک وُہ سسرال میں ہی رہی۔ وہاں پیار، عزت، سبھی کچھ اُسے ملا تھا۔ لیکن اُس کا پتی یوگندر ناتھ موت کے بے رحم پنجے سے کسی طرح بھی نہ بچ سکا۔ مادھوی کے اس جنم کی تمام تر خواہشات اور تمناؤں کا گلا گھونٹ کر اور برج بابو کے سینے میں ایک نہ بجھنے والی آگ لگا کر وہ ہونہار لڑکا راہی مُلکِ عدم ہو گیا۔ یوگندر کے مرنے کے وقت سے ہی مادھوی بلک بلک کر رونے لگی۔ تب پتی نے ہلکے سے دھیمے لہجہ میں کہا۔

"مادھوی تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ یہی مجھ کو سب سے زیادہ دُکھ ہے۔ مرنے سے مجھے کوئی نقصان نہیں، لیکن تم زندگی بھر دُکھوں اور مصیبتوں میں گھری رہو گی۔ یہ سوچ کر دِل بیقرار ہو جاتا ہے اور رُوح تڑپ اُٹھتی ہے۔ جی بھر کر تمہیں پیار بھی نہ کر سکا اور وُہ عزت بھی نہ دے سکا جو دینا چاہتا تھا۔"

یوگندر کے بہتے ہوئے آنسوؤں کی لڑی اُسکے گالوں پر لُڑھک رہی تھی۔ پتی کے آنسوؤں کو اپنے آنچل میں جذب کرتے ہوئے مادھوی نے کہا۔" دوسرے جنم میں جب تمہارے پاؤں میں مجھے جگہ ملے گی تب مجھے جی بھر کے پیار کر لینا اور عزت بھی۔"

اس پر یوگندر نے کہا۔" مادھوی دیکھو میرے زندہ رہنے پر تمہارا مقصد یا فرض مجھے سکھ پہنچانا ہی ہوتا۔ اب اس جیون میں تمہارا فرض ہے کہ سبھی نادار اور دکھی لوگوں کو سکھ پہنچانا۔ اُن کی سیوا کرنا جِسکے چہرہ پر غم کی پرچھائیاں دیکھو۔ جیسے غمگین اور اُداس دیکھو اُسے خوش کرنے کی کوشش کرنا۔ اور زیادہ کیا کہوں مادھوی.....!"

اور پھر مزید کہنے لگا۔ کہ ہمیشہ صحیح راستہ اختیار کرنا۔ تمہارے اچھے ہی کرموں سے میں تم کو پاؤں گا۔"

اُسی دن سے مادھوی بالکل بدل گئی ہے تھوڑا بہت غصہ یا افسوس حسد وغیرہ کی جو اُس میں تھا بھی وہ سب اُس نے پتی کی چتا کی راکھ کے ساتھ ہی گنگا جل میں زندگی بھر کیلئے بہا دیا۔ اس زندگی میں کتنی حسرتیں ہوتی ہیں۔ کتنے ارمان مچلتے ہیں۔ بیوہ ہو جانے پر دِل کے مُردہ ارمان چلے نہیں جاتے، وہ حسرتیں مٹ نہیں جاتیں۔ مادھوی کے دلمیں جب کوئی تمنا کروٹ لیتی ہے تو وہ پتی کی اُنہیں آخری وقت کی کہی ہوئی باتوں کو سوچنے لگ جاتی ہے جب وہی نہیں ہے تو پھر کسی سے نفرت یا پیار کے کیا معنی۔ کس کیلئے دُوسرے کو دُکھ دُوں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے تمام حقیر جذبات اُس کے دِل میں کبھی آئے ہی نہیں۔

وہ ایک امیر آدمی کی لڑکی ہے۔ اُسکی کوئی خواہش، کوئی تمنا ایسی نہیں جو نہ برآئی ہو نفرت اور غصہ کرنا تو اُس نے سیکھا ہی نہیں۔ حسد، بغض اور کینہ تو اُسکے پاس بھی پھٹکنے نہیں پاتے۔ مادھوی کے دلمیں کئی اُمنگیں مچلتی ہیں۔ کئی محبت اور پیار کے پھول کھلتے ہیں اُسکی دِل کی پھلواڑی میں پہلے جب وہ سہاگن تھی۔ تب وہ اِن خوبصورت پھولوں کی مالا گوندھ کر اپنے پتی کو پہنا دیا کرتی تھی۔ لیکن اب پتی کے نہ رہنے پر اُس نے پھولوں کے اُس درخت کو کاٹ نہیں ڈالا۔ اب بھی اُس میں ویسے ہی پھول کھلتے ہیں۔ لیکن وہ مالا میں گوندھ کر

کسی کے گلے کا ہار نہیں بنتے بلکہ زمین پر گر پڑتے ہیں۔ لیکن مادھوی اُنہی پیار کے پھولوں کے گچھے کے گچھے مٹھی بھر کر نادار اور دُکھی لوگوں میں بانٹ دیتی ہے۔ رتی بھر بھی بخیلی سے کام نہیں لیتی۔ چہرے پر اداسی کی لکیر بھی نہیں پڑنے دیتی۔ جہاں تک ہوتا ہے خوش رہنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کی ہی کوشش کرتی ہے۔

برج بابو کی پتنی کا جس دن انتقال ہوا اُسی دن سے اس میں بے ترتیبی بس گئی سب اپنی اپنی فکر میں مگن رہتے تھے۔ سب اپنے اپنے خیالوں میں ہی مستغرق تھے۔ کوئی کسی کا خیال نہ کرتا، کوئی کسی کی اور خاص دھیان نہ دیتا تھا۔ ہر کسی کیلئے ایک ایک نوکر مقرر تھا! اور وہ لوگ اپنے اپنے مالک کا کام کرتے تھے۔ رسوئی میں مہاراج بھوجن تیار کر دیتے تھے۔ اور کسی کھانے پارٹی کے مانند سب لوگ آ آ کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے۔ کسی کو کھانے کو ملتا تھا کسی کو نہ ملتا تھا۔ بھوک کے مارے دُکھی کی کون خبر لیتا کوئی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔

جس دن مادھوی ساون بھادوں کی بھری گنگا کے مانند روپ، پیار اور ممتا لے کر سسرال سے پتا کے گھر لوٹ آئی تھی اُسی دن سے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اُس اُجڑے ہوئے خزاں رسیدہ چمن جیسے گھر میں پھر بہار لوٹ آئی ہے۔ اب سبھی اُس کو بڑی دیدی کہتے ہیں۔ سب ہی مادھوی کو بیحد چاہتے ہیں۔ گھر کا پالتو کتا تک بھی دن بھر کے بعد بڑی دیدی کو دیکھنے کے لئے بہت بیتاب دکھائی دیتا ہے۔ حقیر جانور کو بھی جیسے بڑی دیدی کے درشن کئے بغیر چین نہ پڑتا۔ گھر کے اتنے آدمیوں میں سے ہر ایک گھر کے مالک برج بابو سے لیکر جمعدار، گماشتہ، منیم اور ادنیٰ نوکر تک سبھی بڑی دیدی کے پرستار ہیں۔ سب کے دل میں اُس کی مورتی اور اُس کا خیال ہے۔ سب ہی اُس کے سہارے رہتے ہیں۔ ہر ایک آدمی کو پکا اور زبردست اعتقاد ہے کہ چاہے جس وجہ سے ہو۔ بڑی دیدی پر اُسے دوسروں سے کچھ خاص زیادہ حق ہے۔

سورگ میں جس کلپ درکش کی بابت ہم سنتے ہیں اُسے آنکھوں سے کبھی

دیکھا نہیں ۔ اور یہ بھی نہیں جانتے کہ دیکھیں گے بھی کہ نہیں ۔ لیکن یہ ضرور بغیر کسی حیل وحجت کے اور بغیر کسی شُبہ کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سورج بابُو کے گھر کے لوگوں میں ایک زندہ کلپ ورکش مِل گیا تھا ۔ وُہ کلپ ورکش بڑی دیدی تھی ۔ اُس کے پاس جا کر ہاتھ پھیلانے والا کبھی مایُوس ہو کر نہیں لَوٹا تھا ۔ مُراد پا کر ہی واپس آیا تھا ۔

ایسے قابلِ تحسین وتعریف کُنبہ میں جگہ پا کر سُریندر کو ایک نئے ڈھنگ کا جیون گُزارنے کا طریقہ سُجھائی دِیا ۔ اُس نے جب دیکھا کہ سب نے ایک ہی آدمی پر اپنا بوجھ لاد دیا ہے تو اُس نے بھی وُہی کیا ۔ اگرچہ دُوسرے لوگوں کی بہ نسبت اُس کا عقیدہ مادھوی کے بارے میں کچھ اور تھا ۔ وُہ سوچتا تھا اِس گھر میں بڑی دیدی نام کی کوئی زندہ شے رہتی ہے ۔ وُہ سب کی دیکھ بھال کرتی ہے ۔ خبر لیتی ہے سب کا مان رکھتی ہے خواہشات کو پُورا کرتی ہے ۔ ضِدیں سہتی ہے ۔ پہلے کلکتہ کی سڑکوں پر مارے مارے گھومتے وقت سُریندر کو اپنی آپ ہی فکر کرنی پڑتی تھی ۔ لیکن جب سے وُہ اِس گھر میں آیا تھا تب سے تو یہ بالکل ہی بھُول گیا تھا کہ اُسے ایک دِن اپنے لئے کچھ سامان کرنی پڑی تھی یا مستقبل میں کرنی پڑے گی ۔

کوٹ ، کُرتہ ، دھوتی ، جُوتا ، چھڑی وغیرہ جن اشیا کی ضرورت آدمی کو ہُوا کرتی ہے وُہ سب کافی مقدار میں سُریندر کے پاس موجود تھیں ۔ رُومال تک نہ جانے کون اُس کے لئے کپڑوں میں خیال کر کے ڈھنگ سے ساتھ رکھ جاتا تھا ۔ پہلے اُسے یہ حیرت ہوتی کہ کون رکھ گیا ہے ۔ جب وُہ پُوچھ تاچھ کرتا کہ سب چیزیں کہاں سے آئی ہیں تو جواب مِلتا بڑی دیدی نے بھیجی ہیں ۔ آج کل تو ناشتہ پلیٹ میں رکھ کر آتا ہے اُسے دیکھ کر ہی وُہ سب سمجھ جاتا ہے کہ بڑی دیدی نے ہی اپنے ہاتھ سے سب سجایا ہے ۔

ایک دِن سُریندر جب سوال حل کرنے بیٹھا تو اسے کمپاس کی ضرورت محسوس ہُوئی ۔ اُس نے پرمیلا سے کہا " پرمیلا جاؤ ۔ بڑی دیدی سے کمپاس مانگ لاؤ "۔

بڑی دیدی کو بھلا کمپاس سے کیا کام تھا۔ لیکن مادھوی نے فوراً بازار سے آدمی بھیج کر کمپاس منگوایا اور بھیج دیا۔ شام کو گھوم کر واپس لوٹنے پر سُریندر نے اپنی میز پر کمپاس رکھا دیکھا۔ دوسرے دن صبح پرمیلا نے کہا۔ ماسٹر صاحب دیدی نے کل ہی یہ بھیج دیا تھا — — — — "

اس کے بعد کئی بار سُریندر نے کئی ایسی مزید چیزوں کی فرمائش کی جس کے لئے مادھوی کو بڑی پریشانیاں اُٹھانی پڑیں۔ بہت تلاش کرنے پر کہیں وہ مطلوب چیز ملتی۔ اور تب کہیں وہ سُریندر کی فرمائش پوری کر پاتی۔ لیکن مادھوی نے یہ کبھی نہیں کہا کہ یہ چیز نہیں ہے۔

جیسے کہ اس نے بھی کہہ دیا۔ "پرمیلا بڑی دیدی سے پانچ پُرانی دھوتیاں تو مانگ لاؤ۔ اِن کے اگر ولے کو دینی ہیں"۔

اکثر مادھوی کو اتنی فرصت نہ رہتی تھی کہ وہ نیا پُرانا دیکھ سکے۔ تب وہ ہی پانچ دھوتیاں اُٹھا کر بھیج دیتی تھی۔ اوپر کھڑکی سے اُسے دِکھائی دیتا تھا کہ چار پانچ غریب اور دُکھی آدمی مسرت سے پھولے نہ سماتے ہوئے دھوتیاں لیے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

سُریندر کے یہ چھوٹے موٹے ظلم ہر روز مادھوی کو سہنے پڑتے تھے۔ لیکن مادھوی اِن کی اتنی خوگر ہو چکی تھی کہ اُسے یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ اُن کی گرہستی میں ایک اور آدمی نے آکر اس کے کام کاج اور پریشانیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ مادھوی کو آج کل اِس نو وارد کے متعلق بڑی ہی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بڑی مستعدی سے نگرانی کرنی پڑتی ہے بات یہ ہے کہ اگر سُریندر اپنی ضرورت کے مطابق سب چیزیں مانگ لیا کرتا تب تو کچھ بھی فکر نہ ہوتی۔ لیکن بڑی بھاری فکر اور پریشانی کی وجہ تو یہ ہے کہ وہ نہ بھونده

اپنے لئے تو کچھ بھی نہیں مانگتا ہے۔ اپنے لئے کبھی چیز کی ضرورت ہی نہ بتاتا ہے پہلے پہل تو مادھوی یہ بھی نہ جان پائی کہ سُرِندر اپنے طرف سے بڑا لاپرواہ رہتا ہے کبھی کبھی تو صبح چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ وُہ پیتا ہی نہیں۔ ناشتہ کے لئے مٹھائی کبھی کبھی ویسی کی ویسی ہی رکھی رہ جاتی ہے ہاتھ تک بھی نہیں لگاتا۔ یہ ممکن ہے کہ کُتّے ہی کو سب کھلا کر گھومنے چل دیتا ہو۔ رسوئی میں جب وُہ کھانے کو بیٹھتا ہے تو کھانے کی عزّت ہی نہیں کرنا جانتا کچھ تھالی کے نیچے گراتا ہے۔ کچھ اِدھر اُدھر بکھیر دیتا ہے۔ جیسے کوئی چیز اُسے اچھی ہی نہیں لگتی۔ نوکر لوگ آکر کہتے "ماسٹر صاحب تو کچھ پاگل ہیں، خبطی ہیں، نہ کچھ دیکھتے ہیں نہ کچھ جانتے ہیں۔ نہ کبھی چیز کی پرواہ کرتے ہیں۔ فقط کتابیں لئے بیٹھے رہتے ہیں"۔

کبھی کبھی برج بابو پوچھتے ہیں ــــــ "کہو جی۔ نوکری چاکری کا کہیں کچھ پتہ چلا؟" اس پر سُرِندر ہمیشہ گول مول جواب دے کر ٹال دیتا ہے۔ مادھوی اپنے پتا سے سب کچھ سُن لیا کرتی ہے۔ لیکن یہ بات فقط وُہ ہی جانتی ہے کہ ماسٹر صاحب نوکری کے لئے ذرا سی بھی جستجو نہیں کرتے۔ اور اُن کی نوکری کرنے کی طبیعت بھی نہیں ہے۔ جو کچھ اُنہیں حاصل ہے اُسی پر وُہ قانع ہیں۔ مطمئن ہیں۔

دس بجتے ہی سُرِندر کو نہانے اور ناشتہ کرنے کے لئے مادھوی کو بڑی تاکید کرنی پڑتی ہے۔ اچھی طرح کھانا نہ کھانے پر پرمیلا مادھوی کی طرف سے میٹھی جھڑکی دے دیتی ہے۔ زیادہ رات گئے کتابیں لئے بیٹھے رہنے سے اکثر نوکر آکر گیس کی بتی بجھا دیتے ہیں۔ منع کرنے سے بھی نہیں مانتے۔ کہتے ہیں ــ "ہم کیا کریں بابوجی۔ بڑی دیدی کا یہی حکم ہے"۔

ایک روز مادھوی نے پتا سے مسکرا کر کہا۔ "بابوجی جیسی پرمیلا ہے ویسا ہی ماسٹر بھی اُسے ملا ہے ــــــ"

برج بابو ـــــ "کیوں ـــــــــــ؟"

مادھوی ـــــــ "دونوں ہی بالکل بچے ہیں۔ جیسے پرمیلا کو ابھی تک اِس کا علم نہیں کہ اُسے کب کس چیز کی ضرورت ہے۔ کب کیا کھانا چاہیئے۔ کون وقت کس کام کے لئے مُناسب ہے اپنے تئیں کچھ بھی تو نہیں سوچ سمجھ سکتی۔ بالکل یہی حال اُس کے ماسٹر صاحب کا ہے وُہ بھی اپنی کچھ فکر نہیں کرتے اپنے بارے اور اپنی ضروریات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ اور اُس پر طُرّہ یہ کہ وقت بے وقت ایسی چیز یا منگوا بیٹھتے ہیں کہ اُن کے ہوش و حواس کے درست ہونے پر شبہ ہونے لگتا ہے۔"

برج بابو کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا وُہ مادھوی کا مُنہ تکنے لگے۔

مادھوی نے ہنسکر کہا ـــــــ "آپ کی لڑکی (پرمیلا) کیا یہ جانتی ہے کہ کس وقت اُسے کیا چاہیئے۔"

برج بابو ـــ "نہیں وُہ نہیں جانتی۔"

مادھوی ـــ "اور کبھی کبھی کسی چیز کے لئے بے وقت ضد کر بیٹھتی ہے اور شور مچا کر گھر سر پر اُٹھا لیتی ہے نا ـــــــــ؟"

برج بابو ـــ "ہاں وُہ ایسا ہی کرتی ہے ـــــــــ"

مادھوی ـــ "بس ماسٹر صاحب بھی بالکل ایسا ہی کرتے ہیں ـــــــــ"

برج بابو نے زور سے ہنس کر کہا ـــــــ "یہ لڑکا کچھ پاگل سا معلوم ہوتا ہے ـــــــــ؟"

مادھوی ـــ "پاگل نہیں ہے بابو جی۔ وہ کسی بڑے آدمی کے لڑکے ہیں۔"

برج بابو نے حیران ہو کر پوچھا ـــ "یہ تُم نے کیسے جانا بیٹی! ـــــ؟"

مادھوی کو اِس کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا۔ یہ تو فقط اُس کا اپنا اندازہ تھا۔ وُہ عقلمند تھی۔ اُس نے دیکھا کہ سُریندر اپنا کوئی کام اپنے ہاتھ سے

نہیں کر پاتا۔ دوسروں کا مُنہ تکنا ربتا ہے۔ دوسرا کوئی کرے تو کام ہو۔ نہیں تو پڑا رہے۔ اِس کی یہ عادت دیکھ کر ہی مادھوی سمجھ گئی کہ یہ ضرور کسی امیر ونیکہ آدمی کا نورِ چشم ہے۔ اُسے محسوس ہوتا کہ حسب کچھ اُس کی عادات میں داخل ہے خاص طور پر اس نئے طریقے سے کھانے کی ایجاد نے مادھوی کے خیال کو اور بھی تقویت پہنچائی ہے۔ کھانے پینے کی کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس پر سُریندر کی خاص نظر ہو۔ وُہ کبھی بھی چیز کو سیر ہو کر نہیں کھاتا۔ اُسے کسی چیز کی بھی خواہش نہیں ہے۔

یہ بڑے بوڑھوں جیسا تیاگ اور ساتھ بچّوں کی سی شوخی۔ پاگلوں جیسا جنون۔ کھانے کو دو تو کھا لیتا ہے۔ اور نہ دو تو نہیں کھاتا۔ یہ سب باتیں یہ عادات و اطوار مادھوی کو پُر اسرار سی معلوم۔ اِسی لئے اِس اجنبی اور ناواقف ماسٹر پر ہر وقت چوری چھپے آنکھ رکھتی ہے۔ سُریندر کوئی فضول چیز اپنے لئے کبھی نہیں مانگتا۔ اِس لئے نہیں کہ شرم آتی ہے۔ بلکہ اِس لئے کہ اُسے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اور جب کوئی چیز مقصود ہوتی ہے تو وقت بے وقت کچھ نہیں دیکھتا۔ بس ایک دم بڑی دیدی کے پاس مانگ پہنچ جاتی ہے۔ مادھوی ہنستی ہے۔ اپنے دِل میں کہتی ہے ———— یہ آدمی بھی بالکل بچّوں کی مانند معصوم اور بھولا ہے۔

منورما مادھوی کی بچپن کی سہیلی اور ہجولی ہے۔ بہت دنوں سے مادھوی نے اُسے کوئی خط نہیں لکھا۔ اپنے خط کا جواب نہ پاکر منورما روٹھ گئی تھی۔ آج دوپہر کے بعد تھوڑا سا وقت نکال کر مادھوی اپنی سہیلی کو خط لکھنے بیٹھی۔ اُسی وقت

اُس کی چھوٹی بہن پرمیلا نے آکر پکارا ـــــــ "بڑی دیدی ـــــــ!"

سر اُٹھا کر مادھوی نے پُوچھا ـــ "کیا ہے؟"

پرمیلا نے کہا "ماسٹر صاحب کی عینک نہ جانے کہاں کھو گئی ہے۔ لاؤ ایک عینک دے دو۔"

مادھوی زور سے ہنس پڑی بولی۔ "اپنے ماسٹر صاحب سے جا کر کہو۔ میں کیا عینک کی دوکان لگائے بیٹھی ہُوں ـــــــ؟"

پرمیلا دوڑی ہُوئی ماسٹر کے پاس جانے لگی تبھی مادھوی نے اُسے واپس بُلا لیا۔ "کہاں جاتی ہے ـــ ـــــ؟"

پرمیلا ـــ ـ ماسٹر صاحب سے یہی کہنے ـ ـــــ"

مادھوی ـــــ ماسٹر صاحب کے پاس جانے کی ضرورت نہیں تُو جا کر منیم جی کو بُلا لا ـــــــ"

پرمیلا منیم جی کو بُلا لائی۔ مادھوی نے اُن سے کہا ـــ "ماسٹر جی کی عینک کہیں کھو گئی ہے نمبر دیکھ کر لیے اُن کے لئے ایک اعلیٰ قسم کی عینک لا دیجئے۔"

منیم جی کے چلے جانے پر مادھوی نے منورما کو خط لکھنا شروع کیا۔ خط کے اختتام پر یہ بھی لکھ دیا کہ ـــ میری پرمیلا کو پڑھانے کے لئے بابُو جی نے ایک عجیب ماسٹر رکھا ہے۔ اُسے سیانا بھی کہہ سکتے ہیں اور چھوٹا سا بچہ بھی۔ میں سمجھتی ہُوں اُس نے پہلے پہل پردیس میں قدم رکھا ہے۔ پہلے کبھی وُہ گھر سے باہر نکلا نہیں لگتا۔ وُہ دُنیا کی کوئی بات بھی نہیں جانتا۔ نشیب و فراز کو نہیں سمجھتا۔ اُس کی دیکھ ریکھ کرنا اور خبر لیتے رہنا نہایت ضروری ہے۔ نہیں تو لمحہ بھر بھی اُس کا کام نہیں چل سکتا۔ وُہ اپنی مدد آپ کرنا۔ اپنا کام خود کرنا تو جانتا ہی نہیں۔ میرا اکثر وقت تو یہی لے لیتا ہے۔ تم کو خط لکھوں تو کب اور کیسے۔ اگر جلدی تمہارا اِدھر آنا ہو تو تمہیں اِس

حیرت ہوگی شخصیت کے درشن بھی کرا دوں گی۔ ایسا لمبا اور بھلکڑ اور لاپرواہ آدمی تُم نے کبھی زندگی میں دیکھا ہوگا۔ کھانے کو دو تو کھائے گا۔ اور گر نہ دو تو چُپ چاپ بھوکا پیاسا پڑا رہے گا۔ شاید دن بھر آسے یہ خیال ہی نہ آئے کہ اُس نے کھانا کھایا بھی ہے کہ نہیں۔ مطلب یہ کہ وہ ایک دِن بھی اپنا کام نہیں کر سکتا۔ میں سوچتی ہُوں کہ ایسے ایسے عجیب آدمی بھی دُنیا میں پڑے ہُوئے ہیں۔ میں کہتی ہُوں کہ ایسے آدمی گھر چھوڑ کر پردیس میں آتے ہی کیوں ہیں۔ سُنتی ہُوں کہ اِس آدمی کے ماں باپ زندہ ہیں۔ مگر مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا دِل پتھر کا ہے۔ مَیں تو ایسے آدمی کو لمحہ بھر کے لیے بھی آنکھ سے اوجھل نہیں کر سکتی۔"

مادھوی نے اِس خط کا جواب ازراہِ مذاق میں لکھ بھیجا ـــــ

"تمہارے خط میں دیگر احوال کے ساتھ یہ خبر بھی پڑھنے کو ملی ہے کہ تم نے اپنے گھر "ایک عجیب بندر" پال رکھا ہے اور تم اُس کی سیتا دیوی بن بیٹھی ہو۔ لیکن پھر بھی ہوشیاری سے رہنا میری مخلص رائے ہے۔ تمہاری منورما"

خط پڑھ کر منورما کے چہرے پر لالی دوڑ گئی۔ اُس نے اِس کے جواب میں لکھا ـــــ

"تمہارا مُنہ تو بالکل بھاڑ ہے۔ تُم اِتنا بھی نہیں جانتی۔ تم کو یہ بھی تمیز نہیں کہ کس کے ساتھ کیسی ہنسی کی جاتی ہے۔ کس کے ساتھ کیسا مذاق کرنا چاہیئے۔"

"پرمیلا! تیرے ماسٹر صاحب کا یہ نیا چشمہ کیسا ہے؟" مادھوی نے پُوچھا۔

"بہُت اچھا دیدی"۔ پرمیلا نے جواب دیا۔

مادھوی ـــــ "تم نے یہ کیسے جان لیا ـــــ؟"

پرمیلا ـــــ "ماسٹر صاحب یہ چشمہ لگا کر خوب اچھی طرح کتاب پڑھتے ہیں۔ اِس لیے میں نے سمجھ لیا کہ چشمہ اچھا ہے۔

شکنتلا ـــــ انھوں نے خود اپنی رائے کچھ نہیں دی۔

پرمیلا ـــــ "نہیں تو ـــــ"

مادھوی ـــــ "کچھ بھی نہیں کہا، پسند ہے یا ناپسند۔ کچھ بھی نہیں۔"

پرمیلا ـــــ "کچھ بھی نہیں کہا دیدی ـــــ"

ہمیشہ خوش رہنے والی مادھوی لمحہ بھر کے لئے اُداس ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی اُس جذبہ کو ختم کر کے اُس نے مسکرا کر کہا ـــ "اپنے ماسٹر صاحب سے کہہ دینا کہ اب پھر نہ لکھو دیں ـــــ"

پرمیلا ـــــ "اچھا کہہ دُوں گی ـــــ"

"ہنسنے لگی۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟ اُنہیں شاید بُرا لگے۔" مادھوی نے کہا۔

"تو پھر کچھ بھی نہ کہوں؟" پرمیلا نے پوچھا۔

"نہیں۔" مادھوی نے جواب دیا۔

مادھوی کے بڑے بھائی کا نام شیو چندر تھا۔ مادھوی نے ایک دِن اُس سے کہا ـــ "دادا۔ پرمیلا کے ماسٹر صاحب دِن رات آخر کیا پڑھتے رہتے ہیں۔ تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

شیو چندر بی۔اے کا طالب علم ہے۔ اُس کی نظر میں اس جماعت کے طالب علموں کو پڑھانے والوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اِس لئے اُس نے لاپرواہی دکھاتے ہُوئے کہا۔ ڈرامے اور ناوِل پڑھا کرتا ہے اور کیا پڑھے گا!

مادھوی کو رتی بھر بھی یقین نہ ہُوا اُس نے پرمیلا کے ہاتھ۔ چوری چوری سُریندر کی ایک کتاب منگا کر اپنے دادا (بڑے بھائی) کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ "یہ تو مجھے ڈرامہ یا ناوِل نہیں جان پڑتی" شیو چندر نے شروع کا آخر تک اُلٹ

پلٹ کر کتاب کو دیکھا۔ لیکن وُہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ کتاب کون سی اور کس جماعت کی ہے۔ وُہ فقط اتنا ہی سمجھ پایا کہ اُسے اِس مضمون کا ذرہ بھر بھی علم نہیں اُسے اِس سے رتّی بھر بھی واقفیت نہیں ہے اور شاید کوئی حساب کی کتاب ہے۔

لیکن چھوٹی بہن کے سامنے اپنی ہیٹی کرانا پسند نہ تھا۔ کہنے لگا "یہ حساب کی کتاب ہے۔ سکول میں چھوٹی چھوٹی کلاسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔"

مادھوی کا چہرہ اُتر گیا۔ اُس نے پھر پوچھا۔ کالج میں نہیں پڑھائی جاتی؟ شیوچندر جیسے سُوکھ گیا۔ لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولا۔۔ "نہیں نہیں۔ یہ تو کوئی کتاب ہے۔"

شیو چندر اُس دن سے محتاط ہو گیا۔ دل ہی دل میں ڈرتا کہ کہیں سُریندر کسی وقت اُس سے کوئی سوال نہ کر بیٹھے۔ اور اُس کی قلعی کھُل جائے۔ پھر تایا جی کے حکم سے اُسے بھی پرمیلا کے ساتھ ہی کاپی اور پنسل لے کر اِسی ماسٹر کے پاس پڑھنے بیٹھنا ہو گا۔ اِسی لئے وُہ سُریندر سے دُور دُور رہنے لگا۔

کچھ دن کے بعد ایک دِن مادھوی نے پتا سے کہا ـــ "باپو جی میں کچھ دِنوں کے لئے کاشی جانا چاہتی ہُوں۔"

برج بابو بوکھلا سے گئے ـــ "یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹی! تُم کاشی چلے جاؤ گی۔ تو اِس گھر کی حالت کیسی ہو جائے گی۔ یہاں کا کام کِس طرح چلے گا۔ اِس گھر کا تو نقشہ ہی بدل جائے گا ـــــ"

مادھوی نے ہنسکر کہا ـــ "میں تو واپس آجاؤں گی باپو جی۔ ہمیشہ کے لئے تھوڑے ہی جا رہی ہُوں۔" مادھوی ہنسنے لگی۔ لیکن اُدھر پتا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُس نے یہ محسُوس کیا کہ اس کا یہ کہنا ٹھیک نہیں تھا۔ بات سنبھالنے کے مقصد سے پھر کہا ـــ "باپو جی میں فقط کچھ دِن ہی گھُوم کر کر لوٹ آؤں گی"

اُچھی بات ہے ہو آؤ۔ لیکن بیٹی یہاں کا کام کیسے چلے گا۔"
مادھوی ــــ "کیا میرے بغیر کام رُک جائیں گے؟"
برج بابو ــــ "کام تو نہیں رُک جائیں گے بیٹی۔ ہو گا سبھی کچھ۔ لیکن اِس گھر کی حالت "پتوار" لوٹ جانے پر بھنور میں پڑی ہوئی کشتی جیسی ہو جائے گی"
لیکن مادھوی کا کاشی جانا بہت ضروری تھا۔ وہاں اُس کی بیوہ نند اپنے اکلوتے لڑکے کے ساتھ رہتی تھی۔ اُسے ایک بار دیکھنے تو جانا ہی تھا۔
مادھوی نے کاشی یاترا کے بارے میں ایک آدمی کو اپنے پاس بُلا کر کام سمجھائے اور سونپے۔ بوڑھی نوکرانی کو بُلا کر اپنے پتا، بھائی، بہن کی خدمت کرنے کے لئے خاص طور پر مقرر کیا۔ لیکن ماسٹر صاحب کی خدمت کا کام کسی کو نہیں سونپا۔ وہ بھول نہیں گئی تھی بلکہ جان بوجھ کر ہی نہیں کیا۔ اِن دنوں وہ ماسٹر صاحب سے کچھ چڑ سی گئی تھی۔ مادھوی نے اُس کی بڑی عزت کی۔ اُس کو کسی طرح کی بھی تکلیف نہ ہونے دی۔ لیکن یہ کیسا پتھر دِل انسان ہے کہ ذرا زبان ہلا کر شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ اِس لئے مادھوی پردیس جا کر اِس لا محدود دنیا کے عجیب اور بے وقوف آدمی کو بتا دینا چاہتی ہے کہ وہ بھی ایک عورت تھی۔ کچھ تھوڑے سے مذاق میں کیا حرج ہے؟ اُس کی غیر حاضری میں اُس آدمی کے دن کس طرح کٹتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں کیا نقصان ہے؟ یہی وجہ تھی کہ سُریندر کے متعلق کچھ دیکھنے سُننے یا کرنے دھرنے کے لئے کسی سے کچھ بھی نہ کہا تھا۔
سُریندر ایک سوال حل کر رہا تھا۔ پرمیلا نے کہا۔ "بڑی دیدی تو کل رات کاشی چلی گئی۔ سُریندر کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی۔ لیکن دو تین دن بعد اُس نے دیکھا۔ کہ دس بجتے ہی کھانے کے لئے تقاضہ نہیں ہوتا۔ کسی دن ایک یا دو

تک بچ جاتے ہیں۔ نہانے کے بعد دھوتی بدلتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ دھوتی میلی ہے۔ ناشتہ پر کھانا بھی انواع و اقسام کا اور تازہ نہیں ہوتا۔ رات کو گیس کی بتی بجھانے بھی کوئی نہیں آتا۔ پڑھتے پڑھتے رات کے دو تین بج جایا کرتے ہیں۔ صبح کے وقت نیند نہیں کھلتی۔ اٹھتے اٹھتے بہت دن نکل آتا ہے دن بھر خماری سے میری آنکھیں بوجھل رہتی ہیں اور جسم جیسے ٹوٹتا رہتا ہے تب ماسٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ اس گھر میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے۔ کچھ تغیر آگیا ہے۔ گرمی محسوس ہونے پر ہی پنکھے کی تلاش ہوا کرتی ہے۔ سُرنیدر نے کتاب پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر پوچھا "بڑی دیدی کیا آجکل یہاں نہیں ہیں پرمیلا؟"

پرمیلا ۔۔۔ "نہیں وہ کاشی گئی ہوئی ہیں ۔۔۔۔"

"اسی لئے تو ۔۔۔۔۔"

دو دن بعد اچانک پرمیلا کی طرف دیکھ کر سُرنیدر نے کہا ۔۔۔ "بڑی دیدی کب تک آجاویں گی پرمیلا ۔۔۔۔۔"

پرمیلا ۔۔۔ "ایک مہینے کے بعد ۔۔۔۔۔"

سُرنیدر پھر کتاب میں مستغرق ہو گیا۔ پانچ دن گزر گئے۔ سُرنیدر نے پنسل کو کتاب پر رکھ دیا اور کہا ۔۔۔ "پرمیلا مہینے میں اب کتنے دن باقی ہیں؟"

پرمیلا ۔۔۔ "ابھی تو بہت دن پڑے ہیں ماسٹر صاحب"۔ پنسل اٹھا کر سُرنیدر نے عینک اتاری اور اس کی گرد صاف کرنے لگا۔ اس کے بعد پھر عینک لگا کر کتاب کی طرف دیکھنے لگا۔

دوسرے دن بولا ۔۔۔ "پرمیلا بڑی دیدی کو تم خط وغیرہ تو لکھتی ہو نا"

پرمیلا ۔۔۔ "ہاں لکھتی کیوں نہیں ۔۔۔۔۔"

سُرنیدر ۔۔۔ "انہیں جلدی آنے کے لئے نہیں لکھتی تم ۔۔۔۔۔"

پرمیلا ـــــ "نہیں تو ــــــــ"

سُریندر نے ٹھنڈی سانس بھر کر دھیرے سے کہا "ابھی نہیں تو ـــــ"

پرمیلا نے کہا۔ "ماسٹر صاحب اگر بڑی دیدی آجائے تو بہت اچھا ہو"

سُریندر ـــــ "ہاں بہت اچھا ہو ــــــ"

پرمیلا ـــــ "آنے کے لئے خط میں لکھ دُوں کیا ــــــ؟"

سُریندر خوش ہو گیا، کہنے لگا۔ "ہاں لکھ دو ــــــ"

پرمیلا ـــــ "آپ کے بارے میں بھی لکھ دُوں ــــــ؟"

سُریندر ـــــ "لکھ دو ــــــ"

"لکھ دو" کہنے میں سُریندر کو کچھ بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ کیونکہ دُنیا کی دُنیاداری تو وہ جانتا ہی نہ تھا۔ بڑی دیدی سے پہلے آنے کے لئے کہنا خلافِ معمول ہوگا۔ یہ بات اُس کے دل میں ہی نہ آئی۔ جس کے موجود نہ ہونے سے اُسے بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کے بغیر اُس کا کام نہیں چلتا۔ اُس سے آنے کے لئے کہنے میں کوئی حرج محسوس نہ ہوا۔ جس آدمی میں خود اعتمادی کی کمی ہے اور دُنیاداری سے کورا ہے۔ اُسے سماج سے دُور سمجھنا چاہئیے۔ جس سماج میں عام دُنیادار قسم کے لوگ رہتے ہوں اُس میں رہنا ایسے آدمی کے لئے ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ عام لوگوں سے اُس کے خیالات نہیں ملتے۔ مذاق نہیں ملتا۔ سُریندر کی فطرت میں دُنیاداری بہت کم تھی کہ جتنا اُسے ملتا اُسی پر وہ صابر اور قانع ہو جاتا۔ زیادہ کے لئے جدّوجہد نہ کرتا۔ وہ جتنا کسی کے بارے میں جانتا اُسی پر مطمئن ہو جاتا۔ زیادہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی دیدی کے متعلق اُس کی معلومات زیادہ نہ تھیں۔ اِس گھر میں اُس کے اتنے دن گزرے۔ تقریباً تین مہینے سے وہ بڑی دیدی پر اپنا بوجھ ڈال کر

سُکھ اور چین سے رہ رہا تھا۔ لیکن کبھی اُس نے یہ نہیں پُوچھا کہ بڑی دیدی کیسی ہیں۔ اُن کی عُمر کتنی ہے۔ وُہ دیکھنے میں کیسی ہیں۔ کتنی بڑی ہیں وُہ۔ اُن میں کتنی اور کیا کیا خاصیتیں ہیں۔ کیا کیا گُن ہیں اُن میں یہ ... کچھ وہ رتی بھر بھی نہیں جانتا تھا۔ کچھ جاننے کے بارے میں اُسے کچھ خیال ہی نہیں آیا۔ آدمی کو ایسے ضروری اور بڑا اہمیت اور پیار کرنے والے آدمی کے مُتعلق کچھ جاننے کی خواہش ایک بار بھی اُس کے دِل میں پیدا نہیں ہُوئی۔

سب لوگ دیدی کہتے ہیں۔ وُہ بھی دیدی کہتا ہے۔ سب بڑی دیدی سے پیار و محبّت پاتے ہیں۔ وُہ بھی پاتا ہے۔ وُہ سب کا خیال رکھتی ہے اُس کا بھی خیال رکھتی ہے۔ جہاں بھر کی چیزیں مادھوی کے پاس رکھی ہیں۔ جو آدمی جو کچھ چاہتا ہے وُہی پاتا ہے۔ سُریندر بھی اپنے لئے ضروری چیزیں منگوا لیا کرتا ہے۔ اِس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے؟ بادل کا کام ہے پانی برسانا۔ اور بڑی دیدی کا کام ہے لوگوں سے پیار کرنا اور اُن کا خیال رکھنا۔ جب بارش ہوتی ہے۔ تو جو کوئی ہاتھ پھیلاتا ہے اُسی کو پانی مِل جاتا ہے۔ ٹھیک اِسی طرح دیدی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے سب کو مقصُود چیزیں مِل جاتی ہیں۔ شاید مادھوی بادل کی طرح ہی ہے۔ اُس کے دِل میں کوئی ارمان نہیں کوئی تمنّا نہیں۔ سُریندر نے مادھوی کے بارے میں اِس طرح کا خیال بنا رکھا ہے۔ اِس گھر میں آنے کے بعد ہی جو خیال سُریندر کے دِل میں مادھوی کے بارے میں بن گیا تھا۔ وُہ آج تک ویسے کا ویسا ہی ہے۔ کچھ تبدیلی نہیں ہُوئی اِس میں۔ ہاں اِس کاشی کے واقعہ کے بعد وُہ صِرف اِتنا ہی سمجھ پایا ہے کہ بڑی دیدی کے بغیر اُس کا گُزارہ گھڑی بھر بھی نہیں ہوسکتا۔

جب سُریندر اپنے گھر پر تھا تب اپنے پِتا اور سوتیلی ماں کو جانتا تھا۔ اُن کا کیا فرض ہے یہ بھی خُوب جانتا تھا۔ لیکن وہاں بڑی دیدی ایسی کسی بھی ہستی

سے وُہ متعارف نہ تھا۔ یہاں آکر جب تعارف ہُوا تب اُس کو یُوں ہی جان لیا۔ وُہ بڑی دیدی کی صُورت سے آشنا نہیں۔ وُہ نہیں جانتا کہ بڑی دیدی دیکھنے میں کیسی ہے۔ وُہ صِرف نام سے ہی واقف ہے۔ اِس نام کی ہستی اُس کی کوئی رہنیں۔ فقط نام ہی سب کچھ ہے۔

لوگ جِس طرح اپنے دیوتا کو اصلی رُوپ میں نہیں دیکھ پاتے۔ صِرف اُس کے نام کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ نام ہی کا جاپ کرتے ہیں۔ دُکھ اور مُصیبت میں نام کو ہی بار بار رٹ لگا کر اُس کے آگے اپنا دِل کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ گھٹنے ٹیک کر اور سر بسجود ہو کر رحم اور پیار کی بھیک مانگتے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں تو اُنہیں پُوچھ کر صاف دِل سے جیسے کسی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی دیکھ نہیں پاتے صِرف زبان سے دو ایک ٹُوٹے پھُوٹے الفاظ ہی نکلتے ہیں۔ ٹھیک اِسی طرح سُرنیدر نے بھی دُکھ اور تکلیف پا کر پُکارا ۔۔۔ "بڑی دیدی"۔

دُور مشرق کی طرف سُرخی پھیل چُکی تھی۔ ابھی آفتاب طلوع نہیں ہُوا تھا۔ کہ پرمیلا نے آکر سُرنیدر کے گلے سے لپٹتے ہُوئے کہا: "ماسٹر صاحب"۔ سُرنیدر نے نیند اور سُستی سے اُچھل آنکھیں کھول کر کہا۔ "کیا ہے پرمیلا ۔۔۔۔۔"

پرمیلا نے کہا ۔۔ "بڑی دیدی آگئی ماسٹر صاحب ۔۔۔۔۔"

سُرنیدر اُٹھ بیٹھا۔ پرمیلا کا ہاتھ پکڑ کر بولا ۔ "چلو دیکھ آویں اُنہیں"۔

نہ جانے یہ دیکھنے کی تمنّا اس کے دِل میں کیسے پیدا ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا

کہ اتنے دنوں کے بعد آدمی پرمیلا کا ہاتھ پکڑ کر آنکھیں میچے میچے وہ کیوں لڑ اندر کی طرف چل پڑا لیکن وہ بچہ پھر کچھ بھی ہوا اور پرمیلا کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھس گیا اس کے بعد سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر چھت پر پہنچ گیا۔ مادھوی کے کمرے کے باہر دروازے کے قریب کھڑے ہو کر اس نے پکارا۔ "بڑی دیدی"۔

مادھوی کا خیال کسی اور طرف تھا۔ شاید وہ کوئی کام کر رہی تھی۔ اس نے عادت سے مجبور ہو کر پرمیلا سمجھ کر جواب دیا۔ "کیا ہے؟"

پرمیلا نے کہا۔ "ماسٹر صاحب آئے ہیں"۔

پرمیلا اور سریندر اندر داخل ہو چکے تھے۔ مادھوی یہ دیکھ کر گھبرا گئی۔ لمبا سا گھونگھٹ کھینچ کر ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ سریندر نے کہنا شروع کیا ——

"بڑی دیدی تمہارے نہ ہونے کے سبب مجھے بڑی تکلیف ہوئی"۔

مادھوی نے گھونگھٹ کے اندر ہی شرم سے پانی پانی ہو کر دل میں کہا چھی چھی۔

مادھوی نے اپنے دل میں کہا۔ کیسی شرم کی بات ہے پھر دھیرے دھیرے کہا "پرمیلا ماسٹر صاحب سے کہہ دو کہ کمرہ میں چلے جائیں"۔

پرمیلا نا سمجھ بچہ ہونے پر بھی اپنی بہن کا سلوک دیکھ کر اتنا سمجھ گئی کہ یہ کام ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ اس نے کہا۔ "باہر چلئے ماسٹر جی ——"

سریندر کچھ دیر بت بنا کھڑا رہا۔ اس کے بعد بولا "چلو" وہ اس سے زیادہ کچھ کہنا ہی نہ جانتا تھا۔ اس سے زیادہ بات چیت ہی نہیں کی۔ بات یہ تھی کہ دن بھر پاؤں گھرے رہنے کے بعد آفتاب کے نکل آنے پر جیسے یکایک لوگوں کی نظر اس طرف اٹھ جاتی ہے۔ تھوڑی بھر کے لئے جیسے ہوش ہی نہیں رہتا کہ سورج کی طرف دیکھنا نہیں چاہئے

یا اُدھر دیکھنے سے آنکھوں میں درد ہونے لگے گا۔ اِس کا خیال نہیں رہتا۔ ٹھیک ویسے ہی سُریندر بھی مہینے بھر پردیس میں رہنے کے بعد آئی ہُوئی بڑی دیدی کو بڑی خوشی اَور بڑے اَرمانوں سے دیکھنے گیا تھا۔ وُہ نہیں جانتا تھا کہ اِس کا نتیجہ ایسا ہوگا۔

اُسی دِن سے سُریندر کو لوگوں کے سلُوک میں فرق ہونے لگا۔ مادھوی کو جیسے کچھ جھینپ سی لگی۔ پندو مِمّی اِس بات پر شاید ایک مذاق بھی کر بیٹھی تھی۔ سُریندر بھی کچھ چوکنا ہو گیا۔ آج کل سُریندر کو یہ محسُوس ہونے لگا کہ بڑی دیدی کا عظیم بندھن جیسے محدُود ہو گیا ہے۔ بہن کا پیار، ماں کی ممتا جیسے اب اُسکو چھو بھی نہیں پاتا ہے۔ دُور ہی دُور ہٹتا چلا جاتا ہے۔ ایک دِن سُریندر نے پرمیلا سے پُوچھا——

"جان پڑتا ہے بڑی دیدی آج کل مجھ سے ناراض ہیں۔ کیوں ہیں نا——؟"

پرمیلا——"جی ہاں"۔

سُریندر——"بھلا کیوں"۔

پرمیلا——"آپ اُس دِن کمرے کے اندر کیوں گھُس گئے تھے"۔

سُریندر——"کیا اندر نہیں جانا چاہیئے"؟

پرمیلا——"اِس طرح کہیں کوئی چلا جاتا ہے۔ دیدی بہت ہی ناراض ہیں"۔

سُریندر نے کتاب بند کرتے ہُوئے کہا——"وُہی تو——"

ایک دِن دوپہر کے وقت بادل گھر آئے اور مُوسلا دھار بارش ہونے لگی۔ برج بابو آج دو دِن سے گھر پر نہیں تھے۔ علاقہ میں دورہ کرنے گئے ہُوئے تھے۔ مادھوی کو کچھ کام نہ تھا وُہ فرصت میں تھی۔ پرمیلا اُدھم مچا رہی تھی۔ مادھوی نے اُسے ڈانٹ کر کہا جا اپنی کتاب لا۔ دیکھوں تو۔ تُو نے کیا پڑھا ہے——"

پرمیلا ہٹ پٹا گئی کہ "دیدی رات کو پُوچھ لینا ابھی مجھے کھیلنے دو"۔

مادھوی نے کہا "نہیں نہیں۔ ابھی لا۔ اِسی وقت ————!"

بہت دُکھی سی ہو کر پرمیلا کتاب لینے چلی گئی۔ کتاب لا کر بولی: "ماسٹر صاحب تو آج کل کچھ پڑھاتے ہی نہیں۔ وہ خود ہی پڑھتے رہتے ہیں۔ مادھوی پچھلے سبق پوچھنے لگی۔ شروع سے آخیر تک بہت سے سوال کرنے پر مادھوی کو معلوم ہو گیا کہ ماسٹر صاحب نے سچ مچ کچھ پڑھایا لکھایا نہیں ہے۔ علاوہ ازیں پہلے جو کچھ پڑھایا لکھایا گیا ہے وہ بھی ماسٹر رکھنے کے بعد اِن تین چار مہینوں میں بھول گئی ہے۔ مادھوی نے غصہ میں بندو کو آواز دی اور کہا۔

"جا کر ماسٹر صاحب سے پوچھ آؤ کہ انھوں نے اتنے دن تک کیا کیا ہے۔ کہ پرمیلا کو ایک لفظ بھی نہیں پڑھایا انھوں نے ————؟"

بندو جس وقت پوچھنے گئی اُس وقت سُریندر ایک سوال حل کرنے میں مستغرق تھا۔ بندو نے پوچھا ——"ماسٹر صاحب بڑی دیدی کہتی ہیں کہ آپ نے چھوٹی بیٹا کو کچھ پڑھایا کیوں نہیں؟"

ماسٹر صاحب نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ اب کی بندو نے زور سے پکارا۔

"ماسٹر صاحب!"

سُریندر ——"کیا ہے ————؟"

"بڑی دیدی یہ کہتی ہیں ————"

"کیا کہتی ہیں۔ ————؟"

"چھوٹی بیٹا کو ابھی تک آپ نے کچھ پڑھایا کیوں نہیں ————؟"

اُس نے بڑے صاف لہجہ میں کہا۔ "مجھے پڑھانا اچھا نہیں لگتا۔"

بندو نے کہا۔ "واہ واہ" اور اُس نے جا کر مادھوی سے یہ سب کچھ کہہ ڈالا ——

مادھوی کو غصہ آ گیا۔ اُس نے نیچے آ کر کواڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کر بندو سے کہلوایا ——

"آپ نے پرمیلا کو کچھ پڑھایا ہی نہیں۔

دو تین بار یہی سوال دوہرانے کے بعد جواب ملا ——— "مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔"

بندو نے پھر پوچھا ——— "تو پھر آپ یہاں کس لئے ہیں؟"

سُریندر ——— "یہاں نہ رہوں تو کہاں جاؤں ———؟"

بندو ——— "تو پھر آپ پڑھاتے کیوں نہیں ———؟"

اب سُریندر کو ہوش آیا۔ اُس نے دھیان دے کر پوچھا۔ "ہاں تو کیا کہا؟" بندو اتنی دیر سے جو کچھ کہہ رہی تھی پھر ایک بار دوہرا دیا۔ تب سُریندر نے کہا ——— "پرمیلا تو روز پڑھتی ہے۔"

بندو ——— "وہ تو پڑھتی ہے لیکن آپ کیا دیکھتے ہیں۔"

سُریندر ——— "مجھے دیکھنے بھالنے کا وقت نہیں ملتا۔ فرصت ہی نہیں ہوتی۔"

بندو ——— "تو پھر آپ اِس گھر میں رہتے کس لئے ہیں؟" سُریندر سنجیدگی سے خاموش ہو کر سوچنے لگا۔

بندو ——— "تو اُسے آپ پڑھا نہ سکیں گے ———؟"

مادھوی نے اندر سے خود ہی کہا ——— "پوچھو تو بندو پھر اتنے دنوں سے جھوٹ بول کر یہاں کیوں رہتے تھے؟" بندو نے یہی کہا۔ یہ سُن کر سُریندر کے حساب کے سوال کا جال ایک دم چھن بن ہو گیا۔ اُسے تھوڑا سا دُکھ ہوا۔ لمحہ بھر سوچ کر کہنے لگا "وہی تو۔ بڑی بھول ہوئی مجھ سے ———

"چار مہینے تک لگاتار بھول ہی ہوتی رہی آپ سے ———"

"ہاں ایسا ہی دِکھائی دیتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اِس طرف میرا اتنا خیال ہی نہ تھا۔"

دوسرے دن پرمیلا سُریندر سے پڑھنے نہ آئی اور سُریندر نے بھی کچھ خیال

نہ کیا۔ اِس کے بعد تین دِن تک وُہ غیر حاضر رہی۔

چوتھے پانچویں دِن پرمیلا کو نہ دیکھ کر نوکر سے کہا ــــ "پرمیلا کو بُلا لاؤ۔"

نوکر نے آکر جواب دیا ــ "وُہ اب آپ سے نہیں پڑھیں گی ــــــــ"

سُریندر ــــــ "تو کس سے پڑھینگی اب وُہ ـــــــ؟"

نوکر نے کہا ــ "اب نیا ماسٹر رکھا جائے گا ـــــــ"

نو بج چکے تھے۔ اُس وقت کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد سُریندر نے دو تین کتابیں بغل میں دبائیں۔ عینک اُتار کر ٹیبل پر رکھ دی اور چل پڑا۔

اُسے جاتے دیکھ کر نوکر نے پُوچھا ــ "ماسٹر صاحب اِس وقت آپ کہاں جا رہے ہیں۔؟"

سُریندر ـــــ "بڑی دیدی سے کہہ دینا۔ میں جا رہا ہُوں ـــــــ"

نوکر ـــــ "تو اب آپ نہیں آویں گے ـــــــــــ؟"

سُریندر نے یہ سُنا ہی نہیں۔ بغیر جواب دیئے وُہ پھاٹک سے باہر ہو گیا۔ دوپہر کے دو بج گئے۔ سُریندر لوٹ کر نہیں آیا۔ تب نوکر نے آکر مادھوی کو خبر کی۔ "ماسٹر صاحب چلے گئے"

"کہاں چلے گئے؟"

نوکر ـــــ "یہ تو میں نہیں جانتا۔ نو بجے کا وقت تھا۔ جاتے ہُوئے مجھ سے یہ کہہ گئے تھے کہ بڑی دیدی سے کہہ دینا ــ میں جا رہا ہُوں۔"

مادھوی ـــــ "یہ کیا۔ بغیر کچھ کھائے پیئے ہی چلے گئے؟"

مادھوی فکر مند ہو گئی۔ اُس نے خود سُریندر کے کمرے میں آکر دیکھا سب سامان اِسی طرح رکھا ہُوا ہے۔ ٹیبل پر عینک تک پڑی ہُوئی ہے۔ کچھ کتابیں نہیں ہیں۔

آفتاب دُور مغرب میں جا چھپا۔ فضا پر سُرمئی چادر سی پھیل گئی۔ کچھ دیر بعد مہتاب کے رُخ سے نقاب ہٹائی۔ رُخِ روشن سے نور کی بارش ہونے لگی۔ لیکن سُریندر نہ آیا۔

دوسرے دن مادھوی نے دونوں نوکروں کو بُلا کر کہا۔ "تم اگر ماسٹر صاحب کو ڈھونڈ کر لے آؤ تو تمہیں دس روپے انعام ملیں گے۔" انعام کے لالچ میں نوکر دوڑ دھوپ میں لگ گئے۔ لیکن شام کو نامراد و ناکام ہی لوٹ آئے۔

"بڑی دیدی کہیں پتہ نہیں لگ رہا ہے ماسٹر صاحب کا ——؟"

پُرمیلا نے روتے ہوئے کہا —— "بڑی دیدی ماسٹر صاحب چلے کہاں گئے؟"

مادھوی نے اُسے بہلاتے ہوئے کہا۔ "باہر جا کر کھیل رکا ر رہی کیوں ہے!"

وقت کا بُوڑھا بے رحم گھوڑا باقاعدگی سے دوڑتا رہا۔ جتنے دن بیتے جاتے تھے مادھوی کی پریشانی اُتنی ہی بڑھتی جاتی۔ بُندہ نے کہا —"جانے بھی دو اِتنا ڈھونڈنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اِتنے بڑے کلکتہ شہر میں کیا کوئی دُوسرا ماسٹر ہی نہ ملے گا ——؟"

مادھوی نے بگڑ کر کہا —" دُور ہو جا یہاں سے۔ ایک آدمی جس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ خالی ہاتھ چلا گیا۔ اور تُو کہتی ہے اُس کے ڈھونڈنے کی ضرورت ہی کیا ہے ——؟"

بُندو —— "یہ آپ نے کیسے جانا کہ اُس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے؟"

مادھوی —— "میں خوب جانتی ہوں۔ تجھے اِن باتوں سے کیا مطلب؟ جا اپنا کام کر ——"

بُندو چُپ رہ گئی۔ جب ایک ہفتہ گزر گیا اور سُرینیدر لوٹ کر نہ آیا۔ نہ اُس کا کچھ پتہ چلا تب مادھوی کھانا پینا چھوڑ بیٹھی۔ اُسے یہ محسوس ہوتا کہ سُرینیدر بھوکا پیاسا کہیں مارا مارا پھر رہا ہے۔ جو آدمی گھر میں بھی کوئی منگوا کر کھانا نہیں جانتا۔ وہ کسی اجنبی سے۔ کسی غیر سے کس طرح کچھ مانگ سکتا ہے؟ مادھوی کے دِل میں یہ بات نقش تھی کہ سُرینیدر کے پاس کچھ خرید کر کھانے پینے کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ ساتھ ہی

بھیک مانگنے کا ہنر بھی نہیں ہے۔ اس لئے شاید وہ بچّے کی مانند بھوکا پیاسا ابتر حالت میں کسی سڑک پر پیڑی کے کنارے بیٹھا رو رہا ہوگا۔ یا کسی درخت کے سایہ تلے سرہانے کتابیں رکھ کر سو رہا ہوگا۔

برج بابو نے گھر لوٹ کر جب یہ حال سُنا تو مادھوی سے کہنے لگے "کام تو یہ ٹھیک نہیں ہوا بیٹی"۔ مادھوی نے بڑی مشکل سے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کے سیلاب کو روکا۔

اِدھر سُریندر کا کیا حال ہے وُہ بھی سُنئے۔ تین دِن تو اُس نے بھوکے گھُوم پھر کر بتائے۔ پیسہ پاس نہ ہونے پر بھی نلکے کا پانی مُفت مِل سکتا ہے۔ اِسی سے جب بھُوک شدت اختیار کر لیتی تو چلّو لگا کر پیٹ بھر پانی پی لیتا۔

ایک رات جب وُہ کالی گھاٹ کی طرف جا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں طاقت نہ تھی سارا جسم سُوکھ رہا تھا۔ پھر بھی وُہ ڈگمگاتے پاؤں سے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اُس نے کسی سے یہ سُنا تھا کہ وہاں کھانے کو ملتا ہے۔ ایک رات اندھیری تھی۔ اور اُس پر طرّہ یہ کہ گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ چورنگی کے موڑ پر پہنچتے ہی اُس کے اُوپر ایک گاڑی آ پہنچی۔ خیریت یہ ہوئی کہ گاڑی کے کوچوان نے کسی طرح جلدی سے راس کھینچ کر گھوڑوں کو روک لیا اور سُریندر کی جان بچ گئی۔ لیکن پھر بھی اُس کی چھاتی اور پسلیوں پہ گہری چوٹ لگی اور وُہ بے ہوش ہو گیا پولیس کے سپاہی نے اُسے ایک موٹر میں ڈال کر اسپتال پہنچا دیا۔ پانچ دِن بے ہوشی کی حالت میں پڑے رہنے کے بعد چھٹے دِن رات کو آنکھیں کھولتے ہی پہلے اُس کے مُنہ سے یہی نکلا ——— "بڑی دیدی"!

میڈیکل کا ایک طالب علم اُس رات کو اسپتال میں ڈیوٹی پر تھا۔ یہ الفاظ سُنتے ہی وُہ اس کے پاس آ گیا۔ اُس سے سُریندر نے پُوچھا۔ "بڑی دیدی آئی ہیں کیا ———؟"

جواب ——— "بڑی دیدی کل صُبح آویں گی ———"

دوسرے دِن سُریندر اچھی حالت میں رہا۔ لیکن بڑی دیدی کے بارے میں کچھ نہ پُوچھا
وہ دِن بھر تیز بُخار میں پڑا تڑپتا رہا۔ شام ہونے پر ایک آدمی سے پُوچھا۔ "کیوں جی کیا
میں اسپتال میں ہُوں ——————؟"

"جی ہاں ——————!"

"کیوں ——————؟"

"آپ ایک گاڑی کے نیچے آ گئے تھے ——————"

"بھلا میرے بچ جانے کی اُمید ہے ——————؟"

"جی۔ پُوری اُمید ہے ——————"

دُوسرے دِن میڈیکل کالج کے اُسی طالب علم نے جس سے پہلے دِن بات چیت
ہُوئی تھی پاس آکر پُوچھا —————— "یہاں آپ کی جان پہچان کا کوئی بھی کوئی
آدمی ہے ——————؟"

سُریندر —— "نہیں۔ کوئی نہیں۔"

طالب علم —— "پھر اُس دِن آپ کس کو پکار رہے تھے۔ کیا وہ یہیں کہیں رہتی ہیں۔"

سُریندر —— "رہتی تو ضرور ہیں۔ لیکن وہ یہاں نہیں آسکتی۔ خیر۔ کیا آپ میرے
پتاجی کو میری خبر پہنچا سکتے ہیں ——————؟"

طالب علم —— "جی کیوں نہیں؟"

سُریندر نے پتا کیا پتہ بتا دیا۔ اُس نوجوان نے اُسی دِن خط لکھ کر ڈاک میں ڈال
دیا۔ اِس کے بعد بڑی دیدی کا پتہ ٹھکانہ معلُوم کرنے کی غرض سے اُس نے پھر پُوچھا۔ "یہاں
عورتیں بھی آسکتی ہیں۔ ہم پردہ نشین عورتوں کے لئے علیحدہ انتظام کر دیتے ہیں۔ آپ کی بڑی
بہن کا پتہ معلُوم ہو جائے تو میں اُن کو بھی اطلاع دے سکتا ہُوں۔"

سُریندر نے دم بھر سوچ کر بڑو بابُو کا پتہ ٹھکانہ بتا دیا۔

طالبِ علم ـــــ میرا گھر برج بابو کے گھر کے قریب ہی ہے۔ میں آج ہی اُنہیں آپ کی حالت سے مُطلع کر دُوں گا۔ اگر وُہ چاہیں گی تو دیکھنے آجاویں گی۔"

سُریندر خاموش رہا۔ وُہ جانتا تھا کہ بڑی دیدی کا یہاں آنا قطعی ناممکن ہے۔ اس طالبِ علم نے ترس کھا کر برج بابو کو اسی وقت خبر کردی۔ برج بابو یہ سُن کر چونک اٹھے۔ اُنھوں نے گھبرا کر پُوچھا۔ "وُہ بچ تو جائے گا نا؟"

طالبِ علم ـــــ "یہ اَمر تو یقینی ہے کہ وُہ خطرہ سے باہر ہیں۔"

برج بابو نے اندر جا کر مادھوی سے کہا۔ "بیٹی میں جو سوچ رہا تھا وُہی ہُوا۔ سُریندر گاڑی کے نیچے کُچلا گیا ہے۔ اِس وقت اسپتال میں پڑا ہے۔"

یہ سُنتے ہی مادھوی سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھی۔ برج بابو کہنے لگے۔ "سُنا ہے کہ اُس نے ہوش میں آتے ہی بڑی دیدی کہہ کر پُکارا تھا۔ کیا تُم اُسے دیکھنے نہیں جاؤ گی؟"

اِسی لمحہ ساتھ والے کمرے میں پرمیلا نے نہ جانے کیا گرادیا۔ اُس کی آواز سُن مادھوی اُدھر دوڑی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آکر اُس نے پتا سے کہا۔ "تُم دیکھ آؤ باُبوجی میں وہاں نہ جاؤں گی۔"

برج بابو نے دُکھی ہو کر کچھ مُسکراتے ہُوئے کہا۔ "وُہ تو بالکل جنگلی جانور ہے۔ اُس پر غصّہ کرنا بھی بالکل بیکار ہے۔"

مادھوی کچھ نہ بولی۔ برج بابو اکیلے ہی سُریندر کو دیکھنے چلے گئے۔ اُس کی حالت دیکھ کر اُنہیں بڑا رنج ہُوا۔ اُنھوں نے کہا۔ "اچھا ہو اگر تُمھارے والدین کو خبر کر دی جائے تُمھاری کیا مرضی ہے؟"

سُریندر ـــــ "وہاں خبر بھیج دی گئی ہے۔"

برج بابو ـــــ "اب کچھ ڈر کی بات نہیں ہے۔ گھبرانا مت۔ جلدی اچھے

ہو جاؤ گے۔ تمہاری ماں کے آتے ہی میں تمہیں یہاں سے چلنے کا بندوبست کروں گا۔"
گھر آ کر برج بابو نے مادھوی کو سارا ماجرا سُنایا۔
اُسی دِن سے ہر روز بلا ناغہ برج بابو دِن میں ایک بار سُریندر کو دیکھنے جانے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ وُہ سُریندر سے کچھ لگاؤ سا محسوس کرنے لگے تھے۔ ایک دِن اسپتال سے لوٹ کر اُنھوں نے مادھوی سے کہا ——— "مادھوی تیرا اندازہ تو ٹھیک نِکلا۔ سُریندر کے پِتا تو بڑے اُمیر آدمی ہیں۔"
مادھوی نے پُوچھا ——— "آپ کو یہ کیسے معلوم ہُوا بابُوجی؟"
برج بابو ——— "اُس کے پِتا ایک نامی وکیل ہیں۔ وُہ کل رات آ گئے ہیں۔"
مادھوی چُپ ہو گئی۔ پِتا نے پھر کہا ——— "سُریندر اپنے گھر سے بھاگ کر یہاں آیا تھا۔"
مادھوی ——— "ایسا کیوں؟"
برج بابو ——— "اُس کے پِتا سے آج میری بات چیت ہُوئی تھی۔ اُنھوں نے سارا حال سُنایا۔ اُس نے اِسی سال الٰہ آباد یونیورسٹی سے آنرز کے ساتھ ایم۔اے پاس کیا ہے۔ اِس کے بعد اُس نے ولایت جا کر تعلیم حاصل کر کے ڈگری لینے کی خواہش ظاہر کی تو پِتا اور سوتیلی ماں دونوں نے مخالفت کی۔ بس اِسی سے وُہ ناراض ہو کر گھر سے بھاگ کر کھڑا ہُوا۔ پِتا کا اِرادہ ہے ٹھیک ہوتے ہی وُہ لڑکے کو گھر لے جائیں گے۔"
اُبھرتی ہُوئی سانسوں کو دبا کر اور اُمڈتے ہُوئے آنسوؤں کو پی کر مادھوی نے کہا ——— "یہی اچھا ہو گا بابُوجی ——— ———"

آپ ہی نے درد بخشا تھا ہمیں ۔۵
دیکھئے اب آپ ہی گھبرا گئے

سُریندر کو کلکتہ سے اپنے گھر گئے پانچ چھ مہینے ہو گئے۔ اِس دوران مادھوی نے اپنی سہیلی منورما کو فقط ایک ہی خط لکھا تھا۔

دُرگا پُوجا کے مُبارک موقع پر منورما میکے آئی۔ آتے ہی مادھوری کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی۔

بولی ——"اپنا وہ بندر تو دکھا ———————؟"

مادھوی نے ہنس کر جواب دیا۔ "بندر کہاں سے لاؤں ری ———؟"

منورما نے مادھوی کی ٹھوڑی ہلا کر کہا ——"میں یہی دیکھنے تو دوڑی آئی ہُوں کہ اِن مُقدس قدموں کے پاس رہنے والا تقدیر کا سِکندر بندر کیسا ہے۔ وُہی جسے تُو نے پال رکھا تھا؟"

مادھوی ——کب پالا تھا ری ————؟

منورما نے ازراہِ مذاق لہجے میں کہا ——"کیا یاد نہیں ہے؟ ارے وُہی جو تیرے سِوا کسی اور کو جانتا ہی نہ تھا ————"

منورما کا مقصد پہلے ہی سمجھ چکی تھی۔ اِس لئے اُس کے چہرے کی رنگت بدلتی جا رہی تھی۔ پھر بھی خُود کو سنبھال کر بولی ——"اوہ! ماسٹر صاحب کو پُوچھتی ہے وُہ تو خُود ہی چلے گئے۔"

"ایسے مُقدس قدم بھی اُسے پسند نہیں آئے ————"

مادھوی نے دُوسری طرف مُنہ پھیر لیا کچھ بولی نہیں۔ منورما نے پیار اور

محبت کے ساتھ ہاتھ سے سہیلی کا مُنہ اپنی طرف کیا۔ اُس نے دیکھا۔ اُس کی دِل لگی سے سہیلی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ حیران ہو کر پُوچھا ــــــ "مادھوی یہ کیا ــــــ؟"

اب اور ازیادہ اپنے آپ کو سنبھالنا مادھوی کے لئے ناممکن سا ہو گیا۔ وُہ آنکھوں سے آنچل لگا کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

منورما کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ سہیلی کو تسلّی و تشفی دینے کے لئے اُسے لفظ ہی نہ سُوجھ پڑا۔ اُس نے کچھ دیر مادھوی کو رونے دیا۔ اِس کے بعد زبردستی مُنہ پر سے آنچل کھینچ کر نہایت غمگین ہو کر کہا ــــــ "تم تو معمُولی سی دِل لگی ہی میں رونے لگیں بہن۔ مَیں نہ جانتی تھی کہ اِتنی سی دِل لگی بھی نہ سہہ سکوگی ــــــ"

مادھوی نے اپنی آنکھیں پُوچھتے ہُوئے کہا ــــــ "مَیں بیوہ ہُوں جو بہن ــــــ"

اِس کے بعد دونوں خاموش رہیں۔ دونوں سہیلیاں دِل ہی دِل میں رو رہی تھیں منورما روتی تھی مادھوری کے دُکھ سے اُس کی بیوگی کے غم کو محسُوس کر کے۔ لیکن مادھوی کیوں رو رہی تھی ؟ اِس کے رونے کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ اِس وقت بغیر سوچے سمجھے منورما نے جو مذاق کیا کہ "وُہ تیرے سِوا کسی اور کو نہیں جانتا تھا" وُہی مادھوی کے دِل کو مسلے جارہا تھا۔ مادھوی خوب اچھّی طرح جانتی تھی کہ یہ بات سولہ آنے صحیح ہے۔ بہت دیر کے بعد منورما بولی ــــــ "لیکن کام تو یہ اچھا نہیں ہُوا بہن ــــــ"

مادھوی ــــــ "کون سا کام ــــــ"

منورما ــــــ "یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کیا ؟ میں سب کچھ سمجھ گئی ہُوں۔ اِتنے دِنوں سے۔ لگ بھگ چھ مہینوں سے۔ جس بات کو۔ جس بڑے راز کو مادھوی جی جان سے چھپائے ہُوئے تھی۔ اُسے آج منورما سے چھپانا مشکل ہو گیا۔ چھپانے میں ناکام ہونے سے پکڑی جانے پر مادھوی آنچل میں مُنہ چھپا کر بلک بلک کر رونے لگی۔ بچّہ کی مانند پھُوٹ پھُوٹ کر۔

آخر میں منورما نے کہا ــــــ "لیکن یہ تو بتا۔ وہ چلا کیوں گیا آخر۔ــــ؟"

مادھوی ــــ "میں نے ہی اُسے چلے جانے کو کہا تھا ــــــ"

منورما ــــ "بہت خوب کیا عقلمندی کا ثبوت دیا تم نے ــــــ"

مادھوی نے دیکھا کہ حقیقت منورما کچھ بھی نہ سمجھ پائی۔ یہ جان کر منورما کو شروع سے آخیر تک تمام باتیں سمجھا دیں۔ اس کے بعد کہا ــــــ "لیکن بہن اگر ماسٹر صاحب نہ بچتے تو مَیں پاگل ہو جاتی ــــــ"

منورما نے اپنے دِل میں کہا۔ "اِس وقت بھی پاگل ہونے میں کیا کسر ہے۔"

اُس دِن بہت ہی رنجیدہ اور غمگین ہو کر منورما اپنے گھر لوٹی۔ اسی دِن رات کے وقت کاغذ قلم لے کر منورما اپنے شوہر کو خط لکھنے بیٹھی۔ خط میں لکھا:۔

"تم ٹھیک ہی کہتے تھے کہ عورت ذات کا کچھ بھروسہ نہیں۔ میں بھی آج اِسی کو دوہراتی ہوں۔ کیونکہ آج مادھوی نے مجھے یہ تعلیم دی ہے۔ میں اُسے بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ میرے ساتھ کھیلی پڑھی ہے مَیں اُس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اِسی لئے اُسے مجرم نہیں کہہ پاتی۔ ویسا کیسے کہ ہمت نہیں پڑتی کہ عورت ذات پر الزام لگاؤں۔ مَیں تو پرماتما کو ہی مجرم ٹھہراؤں گی۔ اُس نے کیوں عورت کے دِل کو اِتنا نرم بنایا ہے عورت کے دِل کو اُس نے ایسی نرم شے سے کیوں بنایا ہے؟ بھگوان نے عورت کے سادہ دِل کو اتنا زیادہ پیار اور محبت سے کیوں لبالب بھر دیا ہے۔ کس نے ایسا کرنے کو کہا تھا! اُس نٹ ناگر کے حضور میں میری یہ التجا ہے کہ آئندہ عورت کے دِل کو ذرا زوردار اور سخت بنایا کرے۔ اور تم سے میری یہ درخواست ہے کہ میں اِنہیں قابلِ احترام قدموں میں سر رکھ کر بڑی مسرت پیار اور محبت سے تمہیں دیکھتے ہوئے مرنے کا فخر حاصل کر سکوں مادھوی کو دیکھنے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اُس نے میرے زندگی بھر کے عقیدہ اور اعتماد کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔ سچ مانو میرا بھی بھروسہ نہ کرنا۔ جلدی ہی آ کر اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

جس وقت منورما کے شوہر نے یہ خط پایا۔ اُسی وقت اُس کے جواب میں یہ لکھ بھیجا
"جس کا جو رُوپ ہے وُہ اُسے آشکار کرے گا ہی۔ جس میں جو مادہ ضدین ہیں۔ وُہ
اُنھیں ظاہر کرے گا ہی۔ جس کے دِل میں پیار ہے وُہ پیار کرے گا ہی۔ مادھوی تنا بیل کے
مانند درخت کا سہارا لیتی ہے۔ اُس سے لپٹتی ہے۔ یہی دُنیا کی چال ہے۔ یہی زمانہ کی ریت
ہے۔ جس کس لئے تم باتیں کر رہی ہو کیا کر سکتے ہیں۔ باقی تم فکر نہیں کرو۔ مجھے تم پر پورا
بھروسہ اور اعتماد ہے"۔

منورما نے شوہر کا خط پڑھ کر آنکھوں سے لگایا۔ اور قابلِ پرستش شوہر کے
پاؤں میں تصوّر میں ہی سر جھکا کر جواب میں لکھ دیا:۔

"مادھوی خاندان کے پُر نُور ماتھے پر ایک بدنما داغ ہے۔ ایک بیوہ کو جو نہ کرنا
چاہیئے وُہی اُس نے کیا۔ وُہ دِل ہی دِل میں ایک غیر آدمی سے پیار کرتی ہے"۔

یہ خط پڑھ کر منورما کا پتی دِل ہی دِل میں خوب ہنسا۔ پھر اُس نے مذاق ہی مذاق
میں یہ لکھ دیا:۔

"مادھوی کے ایک بدنما داغ ہوتے میں کچھ شبہ نہیں؟ بیشک وُہ خاندان کے
پُر نُور ماتھے پر ایک بدنما داغ ہے۔ کیونکہ بیوہ ہوتے ہُوئے بھی وُہ ایک غیر آدمی کو
چاہنے لگی ہے۔ تم لوگوں کے ناراض ہونے کی بات ہی ہے۔ کہ بیوہ ہوتے ہُوئے بھی
تم سہاگنوں کے حقوق میں ہاتھ کیوں ڈالے۔ لیکن جب تک میں زندہ ہوں تمہیں فکر مند
ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بہت اچھا موقعہ ہے۔ موقعہ سے پورا پورا فائدہ اُٹھا
کر ایک اور آدمی کو دِل ہی دِل میں پیار کر ڈالو۔ سچ پوچھو تو یہ نئی خبر سُنا کر تم مجھے حیرت
میں نہیں ڈال سکی منورما۔ میں نے ایک جگہ لتا دیکھی ہے۔ وُہ ایک میل تک زمین پر پھیلتی
اور بڑھتی ہُوئی آخر میں جا کر ایک درخت سے لپٹ کر اُس کے اُوپر چڑھ گئی ہے۔ اسوقت
وُہ کتنے ہی پتوں، پھلوں اور پھولوں سے لدی ہُوئی ہے۔ جب تم یہاں آؤ گی تو اکٹھے چل کر

اُسے دیکھ آدیں گے"۔

منورما نے لکھیا کر اُس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اِدھر مادھوی دِن بدِن دُبلی پتلی اور زردسی ہوتی جارہی تھی آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ اُسکا شگفتہ چہرہ مُرجھا گیا تھا۔ روزانہ کے کام کاج میں وُہ ہوشیاری وُہ جوش اَور وُہ پھُرتی نہ رہی۔ کچھ کچھ کاہلی اَور سُستی نے آدبوچا تھا۔ سَب کی خبر رکھنے۔ سَب کی عزت اَور خدمت سے مُطمئین اَور خوش دیکھنے کی تمنا تو ویسی ہی تھی۔ بلکہ اَور زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن کاج کرنے میں اکثر بھُول چُوک ہو ہی جاتی تھی۔ پہلے جیسے مادھوی کبھی بھی کام میں گڑبڑ نہ ہونے دیتی تھی اَور ہر وقت ہر کام کرنے کی یاد رکھتی تھی۔ اَب وُہ بات نہ رہی۔ اکثر بھُول جایا کرتی۔ خیال ہی نہ رہتا۔

ابھی تک سبھی اُسے بڑی عزّت سے بڑی دیدی کہتے ہیں۔ اَب بھی سبھی پناہ گزیں لوگ اُسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اُسی کا مُنہ تاکتے ہیں۔ اَور مقصُود ٹھہراتے ہیں۔ لیکن اب ہری بھری لتا اَب پہلے کے مانند شگُفتہ اَور تر و تازہ نہیں رہی۔ جہاندیدہ لوگوں کے دل میں کبھی کبھی یہ خیال اُٹھتا ہے کہ کہیں یہ لتا مُرجھا کر سُوکھ نہ جائے؟

منورما اَب بھی روزانہ آتی ہے۔ اَور کئی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن وُہی ماسٹر کی چرچا کبھی نہیں ہوتی۔ مادھوی کو اِس سے رنج ہوتا ہے اور یہ بات منورما سے چھُپی بھی نہیں رہتی۔ وُہ سوچتی ہے۔ اَب اِس مسئلہ پر بات چیت نہ کرنا ہی بہتر ہوگا۔ منورما یہ بھی سوچتی کہ یہ بدنصیب اگر اِسی طرح اُسے بھُول جائے تو اچھا ہے۔

اچھا بھلا ہونے پر سُر تیندر پتا کے ہمراہ گھر واپس چلا گیا۔ اَب سوتیلی ماں اُس کی دیکھ بھال کچھ کچھ کرنے لگی تھی۔ اِسی سے سُرتیندر کے جسم میں قدرے طاقت آنے لگی۔ لیکن طبیعت اچھی طرح ٹھیک نہ ہوئی۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ دِل میں ایک کانٹا کھٹکتا رہتا جس کی خلش بہت تکلیف دِہ ہوتی۔ حُسن اور جوانی کی تمنا اور شرارت کی خواہش ابھی تک اُس

کے دِل میں پیدا نہ ہُوئی تھی۔ اِن باتوں کا خیال ہی اُسے نہ آتا۔ پہلے کے مانند وُہ اَب بھی بکھارہتا۔ کام میں لگن پیدا نہ کر سکا۔ کِس کے بھروسے رہنا چاہیئے۔ کون اُس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے خُوشی سے تیار ہو سکے گا۔ یہ وُہ ابھی تک نہ جان پایا تھا۔ مجبور نہ پڑنے پر لاچار ہو کر اپنا کام خُود ہی کر لیتا۔ وہ اُٹھتا نہ تھا۔ اسی لیے وُہ دوسروں کا مُنہ دیکھتا رہتا فرق صرف یہ پڑ گیا کہ اَب پہلے کی طرح وُہ بے دلی سے کیا گیا کام پسند نہ آتا۔ سبھی کاموں میں اُسے کُچھ نہ کُچھ خامی دِکھائی دیتی۔ اُس کی سوتیلی ماں یہ سب دیکھ کر کبھی کبھی کہہ اُٹھتی۔ سُریندر جیسے آج کل بدل سا گیا ہے۔

اِسی دوران ایک روز سُریندر کو بخار چڑھ گیا۔ بڑی تکلیف ہُوئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سوتیلی ماں قریب ہی بیٹھی تھی۔ اُس نے ایک نئی بات دیکھی۔ اُسی وقت اُس کی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔ پیار سے لڑکے کے آنسو پُونچھتے ہُوئے کہنے لگی ——— "بیٹا سُریندر کیا بات ہے؟" سُریندر چُپ رہا۔ اس کے بعد اُس نے ایک پوسٹ کارڈ مانگا اور اُس پر ٹیڑھے میڑھے حروف میں لکھ دیا ——— "بڑی دیدی مجھے بخار چڑھ گیا ہے۔ بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔"

لیکن وُہ خط ڈاک خانہ تک نہ پہنچ سکا۔ پہلے پلنگ سے فرش پر گرا۔ اور وہاں سے جھاڑو دیتے وقت نوکر نے سیب کے چھلکے۔ بسکٹ کے ٹکڑوں۔ انگور کے پٹارے کی رُوئی اُسی طرح کے اور کُوڑے کرکٹ کے ساتھ وُہ خط باہر پھینک دیا۔ اِس طرح سے سُریندر کے دِل کی حسرت مٹی میں مِل کر، ہَوا میں اُڑ کر، شبنم میں بھیگ کر اور دھوپ میں سُوکھ کر انجام کار ببُول کے درخت کے نیچے آ کر پڑی رہی۔

پہلے تو سُریندر کو اُمید تھی کہ خط کے جواب میں لازمی طور پر بڑی دیدی کے درشن ہوں گے لیکن اس کے بعد بڑی دیدی کے ہاتھ کے لکھے ایک کاغذ کے ٹکڑے کے لئے ہی ترستا رہا۔ کئی دِن بیت گئے۔ گھر کوئی جواب نہ آیا۔ کوئی بھی تمنا یا اُمید بر نہ آئی۔ دھیرے دھیرے

بخار کی شدّت کم ہوتی گئی۔ اور کچھ دِنوں بعد صحتیاب ہو کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس کے بعد سُریندر کی زندگی میں ایک نیا سانحہ واقع ہُوا۔ سانحہ گویا بالکل نیا تھا۔ لیکن تھا بالکل قدرتی۔ سُریندر کے والد کو اِس کی اطلاع بہت دِنوں سے تھی۔ اور اِس کے ہونے کی اُمید بھی لگائے بیٹھے تھے۔ سُریندر کے نانا پُونا ضلع کے ایک معمولی زمیندار تھے۔ اِن کی زمینداری میں بیس گاؤں کی تھی۔ سالانہ آمدنی چالیس پچاس ہزار روپے کے لگ بھگ تھی۔ لیکن اُن کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ اِس لئے خرچ کا کم ہونا تو قدرتی اَمر تھا۔

علاوہ ازیں وُہ بڑے کنجُوس بھی تھے۔ اِسی سبب اپنی طویل زندگی میں اُنھوں نے اچھی خاصی رقم جمع کر لی تھی۔ اُن کی وفات پر اُن کی ساری دَولت اور جائیداد اُنکے دوہتے سُریندر کو ہی ملنے والی تھی۔ وُہی اُن کا حق دار تھا۔ سُریندر کے پِتا کو اِس کی پُوری پُوری اُمید تھی۔ ہُوا بھی وُہی۔ سُریندر کے پِتا رائے بابُو کو خبر ملی کہ اُن کے سُسر آخری دَموں پر ہیں۔ اِس لئے وُہ فوراً ہی بیٹے کو ہمراہ لے کر چل پڑے۔ لیکن اُن کے پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ سُسر جی کچھ دیر پہلے ہی کُوچ کر چکے تھے۔

بڑی دھوم دھام کے ساتھ سُسر کی تیرھویں ہو گئی۔ زمینداری کا بندوبست ہوشیار داماد نے اپنے ہاتھوں میں آتے ہی اور بھی ٹھیک ٹھکانے سے دیکھنا بھالنا اور سنبھالنا شروع کر دیا۔ تُند مزاج، عقلمند، جہاندیدہ، اور ہوشیار وکیل رائے بابُو کی کڑی نگرانی سے پریشان ہو کر علاقے کے سارے لوگ بھڑک اُٹھے۔

رائے بابُو کو اب سُریندر کی شادی کا خیال پیدا ہُوا۔ لڑکی لڑکوں کا پتہ لگانے والے دلال گھٹک کہلاتے ہیں۔ اُتر پردیش، مدھیہ پردیش وغیرہ میں یہی کام نائی یا پروہت کیا کرتے ہیں۔ خبر پاکر رائے بابُو کے گھر بھی آنے جانے لگے۔ گاؤں بھر میں دھوم مچ گئی۔ چالیس پچاس کوس تک کی حد کے اندر جہاں کوئی خوبصورت لڑکی تھی وہاں اُس لڑکی کے لیے خوبصورت نوجوان تعلیم یافتہ ورسُریندر ناتھ سے رشتہ کی اُمید کے ساتھ گھٹک پہنچ جاتے۔

اسی طرح دو چار مہینے گذر گئے۔

آخر ایک دن سُریندر کی سوتیلی ماں نے ایک رشتہ منظور کر لیا۔ مہمان آ کر اکٹھے ہونے لگے۔ رشتہ داروں اور دوستوں سے سارا گھر بھر گیا۔

اس کے بعد ایک دن صبح کے وقت ڈھول تاشے وغیرہ باجوں کی آواز اور باراتیوں اور تماشائیوں کے شور و غل اور چہل پہل سے سارا گاؤں گونج اٹھا۔ سُریندر ناتھ شادی کر کے گھر لوٹ آیا۔

لگ بھگ پانچ سال بیت گئے۔ اب نہ سُریندر کے پتا رائے بابو ہی اس دنیا میں موجود ہیں اور نہ مادھوی کے پتا برج بابو ہی زندہ ہیں۔ سُریندر کی سوتیلی ماں اپنے شوہر کی ساری جائداد لے کر اپنے میکے بیٹھ گئی ہے۔

آج کل سُریندر ناتھ کی جیسے تعریف ہوتی ہے ویسے ہی برائی بھی ہوتی ہے۔ ایک پارٹی کے لوگ کہتے ہیں کہ ایسا شریف، مہربان، رحمدل اور بے خطر دوستوں کی عزت کرنے والا زمیندار دنیا بھر میں دوسرا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے خلاف مخالف پارٹی کے لوگ کہتے ہیں کہ ایسا ستانے والا سخت زمیندار اس دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوا۔

یہ دونوں بیان صحیح ہیں۔ پہلی بات تو خود سُریندر ناتھ کے سبب سچ ہے۔ اور دوسری بات اُس کے مینجر متھرا ناتھ کی وجہ سے سچ ہے۔

سُریندر کی بیٹھک میں آج کل دوستوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ وہ لوگ بڑے سُکھ اور آرام کے ساتھ دنیا کے سبھی شوق پورے کرتے ہیں۔ پان، تمباکو، گوشت، شراب اور دیگر

لوازمات ہمیشہ سبھی کے لئے حاضر رہتی ہیں۔ دوستوں کو کسی چیز کے لئے بھی متفکر نہیں ہونا پڑتا خود ہی سب کچھ حاضر ہو جاتا ہے۔

مینجر متھرا بابو اس میں خوب جوش و خروش دکھاتے۔ خرچ کرنے میں وہ کبھی نہیں ہچکچاتے۔ دعوتوں اور جلسوں کے خرچ کے لئے وہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ اُن کا ایسا رعب ہے کہ رعایا خود خوشی سے اس کا سارا خرچ چلاتی ہے۔ متھرا بابو کے حساب کی ایک پائی بھی کسی پر بقایا نہیں رہ سکتی۔ رعایا کے گھروں میں آگ لگوانے میں لوگوں کے بسے بسائے گھروں کو اُجاڑنے میں۔ زمیندار کے دفتر میں ایک چھوٹی سی کال کوٹھری میں قرضدار کسانوں کو قید کرنے اور مارتے مارتے اُدھ موا کر ڈالنے میں جو ہمت وہ دکھاتے ہیں اُس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

رعایا کی چیخ و پکار کبھی کبھی شانتی دیوی (سُریندر ناتھ کی بیوی) کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ مالک سے تنبیہ کے طور پر کہتی ہے ——— "اگر تم اپنی زمینداری کی دیکھ بھال خود نہ کروگے تو سب ستیاناس ہو جائے گا ———"

سُریندر چونک کر کہتا ہے ——— "یہی تو ——— ایسی کیا بات ہے؟"

شانتی دیوی ——— "کیا یہ سچ نہیں کہ گاؤں بھر میں ہمارے علاقے میں بُرائی ہو رہی ہے۔ فقط تم تک ہی یہ باتیں نہیں پہنچ پاتیں۔ جو بیٹیں گھنٹے دوستوں کو لئے بیٹھے رہنے سے کہیں کوئی باتیں سُن پاتا ہے۔ ایسے جابر منتظم کا کوئی کام نہیں اُسے اُبھی جواب دے دیجئے ———"

سُریندر دُکھی ہو کر کہتا ہے ——— "ٹھیک ہے۔ میں کل سے ہی خود ہی سب کام دیکھوں گا ———"

اس کے بعد کچھ دن تک زمینداری کے کام کی دھوم مچ جاتی ہے۔ مینجر صاحب گھبرا اُٹھتے ہیں۔ کبھی کبھی سنجیدگی سے کہتے ہیں "بابو جی اس طرح انتظام میں نرمی کرنے سے بھلا

زمینداری کیسے سنبھل سکے گی۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سختی سے کام لے کر آپ اپنی زمینداری قائم رکھ سکیں گے؟ کبھی نہیں۔ ناممکن ہے۔

سُرنیدر ہنس کر کہتا ہے ۔۔۔۔۔ "غریب، نادار اور دُکھیوں کا خون چوس کر جو زمینداری قائم ہے اُس زمینداری کو بنائے رکھنے سے کیا ہوگا؟ ایسی ظالم اور خونخوار زمینداری کس کام کی متھرا بابو؟"

متھرا بابو ۔۔۔۔۔ "تو پھر مجھے اجازت دیجیئے میں چلا جاؤں؟"

یہ سُنتے ہی سُرنیدر خم پڑ جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد ویسے کا ویسا ہی چکر چلنے لگ جاتا ہے۔ سُرنیدر بہ معمول کے مطابق بیٹھک خانہ میں دوست یاروں کی خاطر مدارت میں لگ جاتا ہے۔ اور پھر چھ چھ دن تک بیٹھک میں ہی پڑا رہتا۔

ابھی حال ہی میں ایک اور نئی مصیبت اُس کے گلے پڑ گئی ہے۔ ابھی جو نیا باغ معہ بارہ دری کے تیار ہوا ہے اِس میں ایک ایلوکیشی نام کی عورت نے کلکتہ سے آ کر ڈیرہ ڈال لیا ہے۔ اُسے ناچنے اور گانے میں کمال حاصل ہے۔ دیکھنے میں بھی اچھی خاصی ہے۔ چھتہ ٹوٹ جانے پر جیسے شہد کی مکھیوں کے گروہ جیسے دل کے دل ایک جگہ سے دوسری جگہ کے لئے چل پڑتے ہیں۔ ویسے ہی اب دوستوں کا دل یاروں کا گروہ اب بیٹھک کو چھوڑ کر اسی طرف جانے لگا ہے۔ دوستوں کو اتنی خوشی ہے کہ وہ اُسے روک نہیں پاتے۔ سُرنیدر کو بھی وہ سب اُدھر لے جاتے ہیں۔ آج تین دن گذر گئے ہوں شانتی کو شوہر کے درشن ہوئے۔ شوہر کو دیکھ کر وہ پیٹھ کر کے دروازے کے سہارے کھڑی ہو کر پوچھنے لگی ۔۔۔۔۔ "اتنے دن آپ کہاں رہے ۔۔۔۔۔؟"

سُرنیدر ۔۔۔۔۔ "باغ کی بارہ دری میں ۔۔۔۔۔"

شانتی ۔۔۔۔۔ "وہاں ایسی کون سی دلچسپی ہے جو تم تین دن تک وہاں ٹھیرے رہے"

سُرنیدر ۔۔۔۔۔ "ہاں! ہے تو ۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔؟"

شانتی ——— "ہر بات میں بس اسی طرح کہہ دیتے ہو۔ میں سب کچھ سن چکی ہوں": کہتے کہتے شانتی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر کہنے لگی ——— "مجھ سے ایسا کون سا گناہ ہوا ہے جو اس طرح ٹھکرا رہے ہو ———؟"

سُریندر ——— "کہاں۔ ایسا تو میں نے ———"

شانتی قطع کلام کرتے ہوئے ——— "اور کیسے ٹھوکر لگانا کسے کہتے ہیں۔ عورت کی بے عزتی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے ———؟"

سُریندر ——— "ہاں ہاں ۔ تو ٹھیک ہے۔ مگر وُہی سب لوگ ———"

شانتی نے کچھ نہیں سُنا اور بھی زیادہ زور سے بلک بلک کر رونے لگی۔ پھر بولی "تم سوامی ہو۔ میرے بھگوان ہو۔ میرا یہ لوک اور پرلوک سب کچھ تم ہی ہو۔ میں کیا تم کو پہچانتی نہیں۔ میں جانتی ہوں۔ میں تمہاری کچھ نہیں ہوں۔ میں ایک دن بھی تمہارے دل کو نہیں بہلا سکی۔ اپنا دُکھ میں کیسے بتاؤں۔ تم شرمندہ نہ ہو۔ تم دُکھی نہ ہو۔ یہ سوچ کر اپنے دل کی بات ——— روح کی گرندیت تمہیں ابھی نہیں بتاتی ———"

سُریندر ——— "تم روتی کیوں ہو شانتی ———؟"

شانتی ——— "روتی کیوں ہوں۔ کیا جواب دوں۔ کیوں روتی ہوں اسے ایشور ہی جانتا ہے میں کیوں روتی ہوں۔ میں یہ بھی سمجھتی ہوں۔ کچھ مجھ سے چھپا نہیں ہے کہ تم میری بے عزتی نہیں کرتے۔ تمہارے دل میں بھی دُکھ ہے۔ تم کیا کرو (آنسو پونچھ کر) میں بھلے ہی زندگی بھر انگاروں پر لوٹوں کوئی حرج نہیں۔ لیکن تم کو دُکھ ہے کیا تکلیف ہے۔ کاش مجھے معلوم ہو سکے .... تو ....؟"

سُریندر نے اُسے اپنے پاس کھینچ کر اپنے ہاتھوں سے اس کے بہتے ہوئے آنسو پونچھ کر۔ پیار سے بڑے میٹھے لہجے میں کہا ——— "تو پھر میں کیا کروں شانتی ———؟"

شانتی ——— "آپ کو اس سوال کا بھلا کیا جواب دیا جا سکتا ہے۔ اس کا

تو کچھ جواب ہی نہیں سوجھ پڑتا۔" شانتی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بہت دیر کے بعد شانتی نے کہا ——— "تمہاری صحت بھی تو آج کل اچھی دکھائی نہیں دیتی ———"

سریندر ——— "آج کیوں پچھلے پانچ سالوں سے ہی اچھی نہیں ہے۔ جس دن کلکتہ کے میدان میں گاڑی کے نیچے کچلا گیا تھا۔ چھاتی میں۔ پیٹھ میں، ہڈیوں میں گہری چوٹیں آئی تھیں۔ مہینے بھر اسپتال میں پڑا رہا۔ اسی دن سے میری صحت ٹھیک نہیں ہے۔ اُس دن کی چوٹ اور تکلیف کسی طرح بھی دور نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی خود مجھے بھی یہ سوچ کر تعجب ہوتے لگتا ہے کہ میں اب تک زندہ کیسے ہوں ———"

شانتی نے شوہر کے سینے پر ہاتھ لگا کر کہا۔ "چلو گاؤں چھوڑ کر اب ہم لوگ کلکتہ چلیں۔ وہیں اچھے اور بڑے بڑے تجربہ کار ڈاکٹر رہتے ہیں۔"

سریندر مسرت سے جھوم اُٹھا کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے چلو۔ وہاں بڑی دیدی بھی ہے ———"

شانتی ——— "بڑی دیدی کو دیکھنے کی تو مجھے بھی بڑی تمنا ہے۔ اُنہیں اپنے گھر لے آؤ گے نا؟"

"لاؤں گا کیوں نہیں؟" یہ کہہ کر ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا۔

"وہ ضرور آ دیں گی۔ میں مر رہا ہوں ——— یہ سُن پاویں ———"

شانتی نے درمیان میں ہی شوہر کا منہ بند کر دیا اور کہنے لگی ——— "تمہارے پاؤں پڑتی ہوں پھر ایسی بات منہ سے نہ نکالنا۔ آہ اگر وہ آ جائیں تو میرے تمام دُکھ دُور ہو جائیں۔"

ایک انجان سے عقیدت کے جذبہ سے شانتی کا دل بھر گیا۔ ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس نے کہا تھا کہ وہ شوہر کی کوئی نہیں ہے۔ لیکن سریندر نے اتنا نہیں سمجھا

اِس طرف اتنا خیال نہیں کیا۔ اِس پہلو کو اُس نے دھیان سے نہیں دیکھا۔ وُہ تو جو کچھ کہہ رہا تھا اُسمیں مست تھا۔ اُس میں بڑا آنند ملتا تھا۔ وُہ اُسی سلسلے میں کہتا گیا ——

"تُم خُود ہی جاکر بڑی دیدی کو بلا لانا شانتی۔ کیوں جاؤ گی نا ——؟"

شانتی نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

سُریندر —— "بڑی دیدی کے آتے ہی تُم خُود ہی دیکھ لینا مجھے کوئی دُکھ نہ رہے گا۔"

شانتی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

دوسرے دِن شانتی نے خادمہ کے ذریعہ مینجر متھرا بابو کے پاس کہلا بھیجا کہ باغ میں جس کو لاکر ٹکایا گیا ہے اُسے ابھی اِسی وقت اگر بھگا نہ دیا گیا تو انہیں مینجری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اِدھر شوہر سے کہا —— "خیر چاہے جو کچھ ہو۔ لیکن اگر تُم نے گھر کے باہر قدم بھی رکھا تو سر ٹیک ٹیک کر اپنی جان دے دُوں گی۔"

سٹپٹایا ہُوا سُریندر کہنے لگا —— "وہی تو۔ ہاں سو۔ مگر یہ لوگ سب ——"

شانتی —— "اچھا تو "مگر" کا بھی بندوبست کئے دیتی ہوں۔" کہہ کر شانتی نے خادمہ کو بُلا کر پھر حُکم دیا۔ "جاکر دروازے پر سپاہی سے کہدے کہ وُہ سب لچے لفنگے اَور بدمعاش میری چوکھٹ پر قدم نہ رکھنے پاویں۔"

مینجر بابو نے دیکھ لیا کہ اب معاملہ بگڑ گیا ہے۔ اِس لئے اُس نے فوراً ایلوکیشی کو بھگا دیا۔ دوستوں کی پارٹی بھی تتر بتر ہو گئی۔ اِس کے بعد مینجر بابو نئے سرے سے دِل لگا کر زمینداری کا کام دیکھنے لگے۔

سُریندر ناتھ کا ابھی کلکتہ جانا فی الحال رُک گیا۔ کلیجے کا درد بھی اب کچھ کچھ گھٹنے لگا تھا۔ کلکتہ جانے کے لئے شانتی بھی اب پہلے جیسی ضِد نہ کرتی تھی۔ وُہ یہیں رہ کر شوہر کی ہر ممکن خدمت کرنے لگی تھی۔ ایک مشہور و معروف تجربہ کار ڈاکٹر کو

کلکتہ سے بُلوا کر خاوند کو دکھلایا۔ ڈاکٹر نے سب دیکھ بھال کر ایک دوا تجویز کی، ساتھ ہی خاص طور سے احتیاط برتنے کی ہدایت کی کہ مریض کے کلیجے کی حالت سخت نازک ہے ایسی حالت میں سخت محنت کا کوئی بھی کام کرنا ٹھیک نہیں۔

اِدھر موقع کی نزاکت کو بھانپ کر منیجر نے جس ڈھنگ سے زمینداری کا کام شروع کر دیا تھا اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علاقہ بھر میں ہاہا کار مچ گئی۔ اسی دوران کبھی کبھی رعایا کی آہ وفریاد ٹھاکرانی کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی۔ لیکن ڈاکٹر کے حکم کا خیال کرتے ہوئے وہ شوہر سے کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔

برج بابو کے ہاں اب برج بابو کی جگہ اُن کا بیٹا شیو چندر مالک ہے۔ گھر کا سارا انتظام مادھوی کے ہاتھوں سے نکل کر نئی بہو کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ بھائی (شیو چندر) آج بھی اُسی طرح خوب پیار و محبت اور عزّت سے پیش آتا ہے۔ لیکن پھر بھی — جانے کیوں اب مادھوی کا دِل یہاں بالکل نہیں لگتا۔ یہاں رہنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ گھر کے تمام نوکر چاکر، مُنیم وغیرہ سب اِس وقت بھی بڑی دیدی ہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ سبھی سمجھتے ہیں کہ صندوق کی کنجی اب دُوسرے ہی کے آنچل سے بندھی رہتی ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب اخذ نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ شیو چندر کی بیوی مادھوی سے بدتمیزی سے پیش آتی ہے۔ یہ کہنا نہیں مانتی۔ لیکن ہاں وہ ایک طرح کا جذبہ ہی ضرور ظاہر کرتی ہے جس سے مادھوی اچھی طرح سمجھتی رہتی ہے کہ اب اِس نئی نویلی بہو کے حکم اور صلاح لئے بغیر کوئی کام کرنا اُس کے لئے مُناسب نہیں۔

تب پتا کا زمانہ تھا۔ اَب بھائی کا وقت ہے۔ تب اور اب میں تھوڑا سا تو فرق ہونا ہی چاہیئے۔ پہلے اُس کا خاص طور پر مان تھا۔ عزّت تھی۔ اُس کی ہٹ کا زمانہ تھا۔ لیکن اَب عزّت ہونے پر بھی ضد نہیں چلنے پائے گی۔ پتا کے پیار اور دُلار سے وُہ اُن دِنوں سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ لیکن اَب جیسے اور سب گھر کے دیگر افراد ہیں۔ ویسے ہی وُہ بھی گھر کے افراد میں ایک فرد ہے۔ گھر کے دوسرے لوگوں میں اِس کی بھی گنتی ہے۔

یہاں پر اگر کوئی مصنّف کے متعلق یہ کہنے لگے کہ وُہ شیوچندر یا اُن کی پتنی پر الزام لگاتا ہے۔ الٹ پھیر کر بار بار اُن کی بُرائی کرتا ہے تو وُہ مصنف کے تئیں ناانصافی ہوگی۔ دُنیا کا جو اُصول ہے۔ جو ریت ازل سے لے کر اَب تک چلی آ رہی ہے۔ اُس کو مصنف یہاں بیان کر رہا ہے۔ مادھوی کے نصیب پھُوٹ گئے ہیں۔ "اپنا" کہہ کر جس پر حق جما سکے ایسی کوئی جگہ اُس کے لئے نہیں۔ مگر اِس سے دوسروں کو کیا؟ وُہ اپنی چیز پر دعوےٰ کرنا کیوں چھوڑ دیں؟ وُہ اپنا چھوٹے سے چھوٹا معمولی سے معمولی بھی حق کیوں چھوڑیں۔ شوہر کی چیز پر بیوی کا حق ہوتا ہی ہے۔ یہ کون نہیں جانتا؟ کیا شیوچندر کی بیوی ہی یہ بات نہیں جانتی۔ شیوچندر تو مادھوی کا بھائی ہے۔ مگر اُس کی بیوی مادھوی کی کون ہے؟ وُہ کِسی غیر کے لئے اپنا حق کیوں چھوڑ دے۔ مادھوی یہ سب خُوب سمجھتی ہے۔ بھاوج جب بالکل چھوٹی تھی اور برج بابُو زندہ تھے تب مادھوی کی نظر میں چھوٹی بہن پرمیلا اور بھاوج دونوں ایک تھیں لیکن اب بات بات میں بھاوج کی رائے نہیں ملتی۔ مادھوی دِن کہتی ہے تو وُہ رات کہتی ہے۔ مادھوی بچپن سے ہی ضدّی طبیعت کی اور غضب کی حسّاس بھی۔ ذرا سی بات بھی اُس کے دِل میں لگ جاتی ہے۔ اِسی لئے اَب وُہ اپنے آپ کو سب سے حقیر سمجھتی ہے۔ کسی کی بات برداشت کرنے کی طاقت اُس میں نہیں۔ اِسی لئے وُہ کچھ بولتی ہی نہیں۔

جہاں اُس کا کچھ زور نہیں ہے وہاں سر اونچا کر کے کھڑا ہونے میں شرم کے مارے جیسے اُس کا سر جھک جاتا ہے۔ دِل کو کچھ تکلیف پہنچنے پر وہ چُپ چاپ اُسے برداشت کر لیتی ہے۔ شیو چندر نک سے وہ کچھ کہتی سُنتی نہیں۔ پیار کا ثبوت دینے کا اُسے ذرا بھی ڈھنگ نہیں اِسی وجہ سے اسے کسی طرح سے بھی اپنا حق جتانا بالکل پسند نہیں۔ ایسے حق کا خیال بھی اُس کے دِل میں آنے پر اُسکے جسم اور دِل سے لعنت کی ہمدا اُٹھنے لگتی ہے۔ عام عورتوں کی طرح لڑنے جھگڑنے سے اُسے کیتنی شدید نفرت ہے۔ وہ صرف وُہی جانتی ہے۔

ایک دِن مادھوی نے بھائی کو پاس بُلا کر کہا ــــــــ "دادا میں سسرال جاؤں گی"۔ شیو چندر نے حیرانی سے پُوچھا ــــــــ "ایسا کیوں دیدی۔ وہاں تو تمہارا اپنا کوئی بھی نہیں"۔

مادھوی نے مرحوم شوہر کی تصویر پر اشارہ کرتے ہوئے کہا ــــ "چھوٹا بھانجا کاشی جی میں نندجی کے پاس رہتا ہے اُسے ساتھ لے کر میں گول گاؤں میں اچھی طرح رہ سکوں گی"۔

پٹنہ ضلع میں گولا گاؤں میں مادھوی کی سسرال تھی۔ شیو چندر نے سوکھی ہنسی ہنس کر کہا ــــ "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہاں تمہیں بڑی تکلیف ہوگی ــــــ"

مادھوی ــــــ "تکلیف کیوں ہونے لگی مجھے۔ وہاں گھر تو ابھی ویسے کا ویسا ہی بنا کھڑا ہوا ہے۔ دس پانچ بیگھے زمین بھی اپنی ہے۔ ایک بیوہ کا گذر بسر کیا اتنے میں نہ ہو سکے گا؟"

شیو چندر ــــ "گذر ہونے کی بات میں نہیں کہتا۔ روپے پیسے کی تو کچھ فکر ہی نہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ وہاں ویرانے میں اکیلے رہنے میں بڑی تکلیف ہوگی"۔

مادھوی ــــــ "کچھ بھی تکلیف نہ ہوگی ــــــ"۔

شیو چندر ——— (تھوڑی دیر سوچ کر) "مگر تم یہاں سے جانا کیوں چاہتی ہو؟ مجھے سب واضح طور پر بتاؤ۔ میں سب جھگڑے ابھی نپٹائے دیتا ہوں۔"

اِس سے پہلے جان پڑتا ہے کہ شیو چندر نے اپنی بیوی سے بہن کے خلاف کچھ ضرور سُنا ہوگا۔ اُسی کا خیال آنے پر اُس نے یہ بات بھی کہی ہوگی۔ شرم سے مادھوی کا مُنہ سُرخ ہو گیا۔ کہنے لگی ——— "دادا کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں لڑ جھگڑ کر منہ پھلائے گھر سے کہیں چلی جاؤں گی۔"

شیو چندر خود بھی شرمندہ ہُوا۔ کہنے لگا ——— "نہیں نہیں دیدی۔ میرے کہنے کا مطلب فقط اِتنا ہی ہے کہ یہ گھر ہمیشہ سے تمہارا ہی ہے۔ پھر تم کیوں یہاں سے جانا چاہتی ہو؟"

ایک ساتھ دونوں ہی کو اپنے مرحوم مہربان پِتا کا خیال آگیا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آنچل سے آنسو پونچھ کر مادھوی نے کہا ——— "میں کیا ہمیشہ کے لئے جا رہی ہُوں۔ پھر آؤں گی تمہارے لڑکے کا جنیو ہوگا تب مجھے وہاں سے لے آنا۔ اِس وقت مجھے جانے دو بھیّا ———!"

شیو چندر ——— "یہ موقع تو کہیں آٹھ دس سال میں آئے گا ——— "

مادھوی ——— "اگر زندہ رہی تو ضرور آؤں گی ——— "

مادھوی کسی طرح بھی پِتا کے گھر میں رہنے کو تیار نہیں ہُوئی۔ اور اپنے جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اُس نے نئی آئی ہُوئی رسوئی بہو کو ساری گھر گرہستی سونپ دی۔ سب کچھ سمجھا بُجھا دیا۔ نوکر چاکروں کو بُلا کر اُنہیں آشیرواد دیا۔ جس دِن جانے کا مُبارک مہورت تھا اُس دِن آنکھوں میں آنسو بھرے ہُوئے شیو چندر اپنی بہن کے آگے کھڑا ہو کر کہنے لگا ——— "مادھوی تیرے دادا نے تجھے کبھی کچھ کہا سُنا نہیں۔"

مادھوی نے مُسکرا کر کہا ——— "یہ کیسی باتیں کر رہے ہو دادا؟"

شیو چندر ـــــ "میں یہ نہیں کہتا ہوں۔ اگر کسی بُری گھڑی میں۔ کسی دن میرے مُنہ سے بے خیالی میں کُچھ ـــــــ؟"

مادھوی! ـــــ "نہیں دادا۔ تُم نے تو مُجھے کبھی کُچھ نہیں کہا۔"

شیو چندر ـــــ "سچ؟ ـــــــــ؟"

مادھوی ـــــ "ہاں سچ ـــــــــ"

شیو چندر ـــــ "اچھا تو جاؤ۔ تمہیں اپنے گھر جانے کے لئے میں اب منع نہیں کر سکتا ہوں۔ جہاں تمہیں اچھا لگے وہیں رہو۔ مگر ہاں ہمیشہ اپنی خیر و عافیت سے مُطلع کرتی رہنا۔ کبھی بھولنا نہیں ـــــــ"

مادھوی سب سے پہلے کاشی گئی۔ وہاں جاکر اپنے بھانجے کو ساتھ لیا۔ وہاں سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر گوکلا گاؤں میں آگئی۔ آج سات سال کے بعد اُس نے دوبارا اپنی سُسرال کی دہلیز پر قدم رکھا۔

اب تو گوکلا گاؤں کے چیٹرجی مہاراج پر جیسے بڑی بھاری مُصیبت کا پہاڑ ٹُوٹ پڑا۔ اُن سے اور یوگندر (مادھوی کا پتی) کے پتا سے بڑی گہری دوستی تھی۔ اِسی لئے مرتے وقت یوگندر اپنی کئی بیگھے زمین اُنہیں کو سونپ گئے تھے۔ یوگند کی زندگی میں بھی وُہی اِس زمین کا بندوبست اور دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ یوگندر اُس طرف سے بالکل لاپرواہ رہتا تھا۔ اُس کے سُسر (مادھوی کے پتا) کے پاس کافی دولت تھی اِس لئے یوگندر کو اپنے پتا کی دی ہُوئی اِس معمُولی جائیداد کی کُچھ زیادہ پرواہ نہ تھی۔ اِس کے بعد یوگندر کے مرجانے پر چیٹرجی مہاراج نے مکمل طور پر ملکیت پاکر بے فکر ہوکر بغیر کسی رُکاوٹ کے اُس ساری زمین کی آمدنی اپنے کام میں لانے لگے۔ لیکن اب اِتنے دِنوں کے بعد یوگندر کی بیوہ مادھوی نے آکر اصول اور قاعدے کے ساتھ بندھی ہُوئی اُن کی سُکھ کی گرہستی۔ مُفت مِل گئی۔ زندگی میں گڑبڑ مچانے کی خبر دی۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بیالاک چیٹرجی

مہاراج کو یہ مادھوی کا آنا بہت بُرا اور ناجائز جان پڑا۔ اُنہیں صاف صاف دکھائی دینے لگا کہ مادھوی نے جلن کے مارے جان بوجھ کر یہ شوشہ کھڑا کیا ہے۔ اُنہیں نے سنبھل کر مادھوی کے پاس آکر کہا۔

چیڑ جی! ـــــــ "سُنتی ہو بہو۔ تمہاری وہ جو دو بیگھے زمین پڑی ہے اُس پر دس سالہ لگان کی رقم چڑھ چکی ہے۔ بمعہ سود کے کل سو روپے ہو گئے ہیں۔ اگر یہ روپیہ نہ دیئے جائیں گے تو یہ زمین نیلام ہو جائے گی۔ سمجھی! ـــــــ"

مادھوی نے اپنے بھانجے سنتوش کمار سے کہلوایا۔ ـــــ "روپوں کے لئے فکر کی ضرورت نہیں۔"

اس کے بعد لڑکے کے ہاتھ سو روپے اُسی وقت بھجوا دیئے۔ قارئین کو یہ بتلا دینے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ روپے چیڑ جی نے اپنے ہی کام میں خرچ کر دیئے۔

لیکن مادھوی اِس طرح آسانی سے چھوڑنے والی عورت نہ تھی۔ اُس نے سنتوش کو بھیجکر پوچھا! ـــــــ "صرف اِن دو بیگھے زمین سے ہی تو میرے مرحوم سسر جی کو گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ باقی جو زمین ہے وہ کہاں اور کس کے ماتحت ہے؟"

یہ سُنتے ہی چیڑ جی آگ بگولا ہو اُٹھے۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کہنے لگے۔ "وہ تو ساری زمین بک گئی۔ کچھ تھوڑی سی ساجھے میں جوتی اور بوئی جاتی ہے آٹھ دس سال سے زمیندار کو لگان نہ دیا جائے گا تو زمین کیسے بچی رہے گی۔"

مادھوی! ـــــــ "کیا زمین سے کچھ بھی آمدنی نہیں ہوتی تھی جو لگان کے روپے بھی نہیں دیئے جا سکے۔ اور اگر زمین سچ مچ زمین بک ہی گئی تو اُسے کس نے بیچا اور جس نے خریدا معلوم ہو تو اُس کو پھر واپس لینے کی کوشش کی جائے۔ زمین کی خرید و فروخت کے تمام کاغذات کہاں ہیں ـــــــ؟"

چیڑ جی مہاشہ نے اُن سوالات کے جواب میں کچھ کہا ضرور تھا۔ لیکن مادھوی کی سمجھ

یں کچھ بھی نہ آیا۔ چیٹرجی بڑبڑاتے ہوئے گول مول زبان میں نہ جانے کیا بک گئے۔ اس کے بعد پھر سر پر چھاتا تان کر رام نامی چادر کمر میں لپیٹے ہوئے ایک کوری دھوتی انگوچھے میں باندھ کر لالتا گاؤں کی طرف زمیندار کے دفتر جانے کے لئے اُسی دن چل پڑے۔ اسی لالتا گاؤں میں ہمارے محترم زمیندار کا گھر اور اُن کے مینجر متھرا بابو کا دفتر بھی ہے۔ چیٹرجی آٹھ دس کوس راہ پیدل چل کر ایک دم متھرا بابو کے حضور میں جا حاضر ہوئے اور رو کر کہنے لگے۔ "دوہائی ہے مینجر صاحب۔ معلوم پڑتا ہے اب مجھ غریب براہمن کو دَر دَر بھیک مانگ کر پیٹ اور پریوار پالنا ہوگا"۔

"اس طرح کے بہت لوگ آیا کرتے ہیں"۔ متھرا بابو نے مُنہ گھما کر کہا ــــــ "ہوا کیا ہے؟ کچھ کہو بھی تو ــــــ؟"

چیٹرجی ــــــ "بھیّا براہمن کی رکھشا کرو ــــــ"

مینجر بابو ــــــ "ارے کچھ بولوگے بھی کیا ہوا ــــــ؟"

تب چیٹرجی نے وُہی مادھوی کے آئے ہوئے سَو روپے کمر سے نکال کر متھرا بابو کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے ــــــ "آپ دیا لُو ٹھہرے آپ ہمارے محافظ ہیں۔ اگر آپ ہماری حفاظت نہ کریں گے تو اور کون کرے گا۔ میرا تو ستیاناس ہو رہا ہے ــــــ"

مینجر ــــــ "مجھے سب معاملہ مختصر طور پر سمجھاؤ ــــــ"

چیٹرجی ــــــ "بات یہ ہے کہ گولا گاؤں کے رہنے والے رام تنو سانیال کی بہو مادھوی اتنے دِنوں کے بعد لوٹ آئی ہے۔ اور اب ساری زمین پر قبضہ جمانا چاہتی ہے"

متھرا بابو نے ہنس کر کہا ــــــ "وہ تمہاری زمین جائیداد پر قبضہ جمانا چاہتی ہے یا تم اُس کی کُل کائنات پر ہاتھ صاف کر دینا چاہتے ہو؟ اصلیت کیا ہے؟"

پھر براہمن نے اپنے دونوں ہاتھوں میں جنیؤ لپیٹ کر قسم کھاتے ہوئے مینجر کا ہاتھ پکڑ کر کہا ــــــ "میں دس سال سے اُس زمین کا لگان دیتا آ رہا ہوں"۔

منیجر ——— "جب زمین سے فائدہ اُٹھاتے ہو تو کیا لگان نہیں دو گے؟"

چیڑجی ——— "دوہائی ہے آپ کی حضور ———"

منیجر صاحب سب کچھ سمجھ گئے۔ بولے ——— "بیوہ کو چکّر دے کر زمین ہضم کرنا چاہتے ہو نا ———؟"

چیڑجی چُپ چاپ منیجر کا مُنہ تکتے رہے۔

منیجر ——— "کُل کتنے بیگھے زمین ہے؟"

چیڑجی ——— "پچیس ۲۵ بیگھے۔"

منیجر بابو نے زبانی حساب لگا کر کہا۔ "کم از کم تین ۳ ہزار روپے تک کی جائیداد ہے۔ اچھا زمیندار کو کتنی رقم نذرانے میں دو گے ———؟"

چیڑجی ——— "آپ کا جو حُکم ہو گا وُہی دُوں گا سرکار۔ تین ۳۰۰ سو روپیہ تک دے دُوں گا۔"

"تین سو دے کر تین ۳ ہزار ہضم کرنا چاہتے ہو چیڑجی۔ جاؤ یہ کام مجھ سے نہ ہو سکیگا۔"

براہمن نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ——— "آپ کتنے روپوں کا حُکم دیتے ہیں ———؟"

منیجر ——— "ایک ہزار روپے تک دے سکو گے ———؟"

اِس کے بعد دونوں بہت دیر تک تنہائی میں بات چیت اور صلاح مشورہ کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ یوگندر کی بیوہ مادھوی پر زمیندار کی طرف سے باقی دس سال کا لگان اور اُس کا سُود لگا کر کُل ڈیڑھ ہزار رُوپے کی نالش ہو گئی۔ سمن جاری ہُوا۔ لیکن مادھوی تک نہ پہنچا۔ اِس کے بعد یک طرفہ ڈگری بھی ہو گئی اور ڈیڑھ مہینے کے بعد مادھوی نے سُنا کہ باقی لگان کی وصُولی کے لئے زمیندار کی طرف سے اُس کی زمین اور گھر تک نیلام کرنے کا اشتہار جاری کیا گیا ہے۔ اِس کی ساری جائیداد قُرق ہو گئی۔

یہ سُن کر مادھوی نے ایک پڑوسن کو بُلا کر کہا ——— "بہن کیا تمہارے دیش میں بالکل اندھیر نگری ہے ———؟"

پڑوسن ——— "ایسا تو نہیں۔ کیوں کیا ہُوا ———؟"

مادھوی ——— "مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ ایک شیطان اور جعل ساز دھوکہ دے کر اور جعل کر کے میرا سب کچھ ہڑپ کر لینا چاہتا ہے اور تم لوگ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ تمہیں ذرا رحم نہیں آتا۔ اوہ! یہ کیسا اندھیر ہے بھگوان؟"

پڑوسن! ——— "مگر میں کر ہی کیا سکتی ہُوں؟ ہم لوگوں کے بس میں کیا ہے؟ زمیندار اگر تمہاری زمین جائیداد نیلام کرے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ہم غریب اور لاچار لوگ کر ہی کیا سکتے ہیں؟"

مادھوی! ——— "خیر میں نے یہ بھی مان لیا۔ یہ پُوچھتی ہُوں۔ میرا گھر نیلام ہو گیا اور مجھے اُس کی خبر تک نہ ملی یہ کیا بات ہے؟ تمہارا زمیندار بھی کیسا ہے؟"

تب پڑوسن نے ساری باتیں تفصیل سے کہنی شروع کیں ——— "ایسا ظالم زمیندار اور ایسا اندھیر، اور ایسا ظُلم اِس دیش میں کبھی کسی نے دیکھا سُنا نہیں۔ اُس پڑوسن نے اور بھی نہ جانے کیا کیا بُرائی کی۔ آج تک لوگوں کی زبان سے زمیندار کے متعلق جو کچھ اُس نے سُنا تھا اور جو کچھ وُہ خُود جانتی تھی وُہ سب ایک ایک کر کے اُس نے کہہ سُنایا۔ مادھوی نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا۔ "اچھا میں خُود زمیندار سے کہوں سُنوں تو کیا کچھ اُمید ہے؟ اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اپنے لئے نہیں فقط بھانجے کے لئے۔ مادھوی سب کچھ کرنے کو تیار بیٹھی تھی۔ پڑوسن اِس بارے میں اُس وقت کچھ صلاح نہ دے سکی۔ لیکن جاتے وقت یہ وعدہ کرتی گئی کہ کل وُہ اپنی بہن کے لڑکے سے اچھی طرح پُوچھ تاچھ کر کے آئے گی اور بتلائے گی کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ اُس کی بہن کا لڑکا دو تین دفعہ لالتا کا ڈل تک ہو آیا تھا۔ زمیندار کے یہاں کی بُہت سی باتیں وُہ جانتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس دِن باغ میں ایلوکیشی کے آنے رہنے اور

بھگائے جانے کی خبر تک بھی وہ سُن آیا تھا۔ اُس کی موسی نے جب اُس سے یہ کہ رام تی کی بیوہ زمیندار بابو سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ اِس میں تیری کیا رائے ہے۔ تو اُس نے مُنہ بنا کر سنجیدگی سے پُوچھا ــــ "اس بیوہ کی عمر کیا ہوگی؟"

"بیس اکیس سال کی ہوگی۔"

اُس نے پھر سر ہلا کر پُوچھا ــــ "دیکھنے سُننے میں کیسی ہے؟"

"بالکل پری جیسی دکھائی دیتی ہے۔"

اُس نے عجیب ڈھنگ سے مُنہ پچکا کر کہا ــــ "ہاں تو ملاقات کرنے سے اُس کا کام ٹھیک ہو جانے کی بہت کچھ اُمید کی جا سکتی ہے۔ لیکن سچ پُوچھو تو میری رائے یہی ہے کہ وہ آج ہی رات کو چُپ چاپ ناؤ پر بیٹھ کر اپنے باپ کے گھر چلی جائے۔ اِسی میں اُس کی خیریت ہے۔"

پڑوسن ــــ "ایسا کیوں ــــ؟"

لڑکا ــــ "تم کہتی ہو نا کہ وہ دیکھنے میں پری جیسی حسین ہے۔"

پڑوسن ــــ "تو پھر اِس سے کیا ہُوا ــــ؟"

لڑکا ــــ "اِسی سے تو خطرہ ہے کہ۔ پری جیسی حسین دوشیزہ زمیندار بابو کی نظروں میں پڑ کر پھر اپنے دھرم کی حفاظت کسی طرح بھی۔ کسی حالت میں بھی نہیں کر سکتی سمجھیں تم ــــ"

پڑوسن ــــ "کیا کہہ رہا ہے تُو؟ یہ حال ہے؟"

لڑکا ــــ (ہنس کر) "ہاں موسی یہی حال ہے۔ وہاں کے سب لوگ جانتے ہیں۔"

پڑوسن ــــ "تب تو اُس کا زمیندار سے ملنا ٹھیک نہیں۔"

لڑکا ــــ "کسی طرح بھی نہیں۔"

پڑوسن ــــ "لیکن یُوں ہی بیٹھے رہنے سے بے چاری بیوہ کا سب کچھ چلا جائے گا۔"

رڈکا ——— " وُہ بے ایمان اور کمینہ چیٹرجی جب اِس مُعاملہ میں موجُود ہے تب زمین اور جائیداد بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ بے چاری بیوہ کیا گرہستھ کے ساتھ دھرم کو بھی گنوادے گی ۔؟"

دُوسرے دِن پڑوسن نے آکر مادھوی سے سارا واقعہ شروع سے لے کر آخیر تک سُنا ڈالا ۔ سُن کر مادھوی سناٹے میں آگئی ۔ زمیندار سُریندر کی کالی کرتوتوں کے متعلق وہ اب تک بہت کچھ سُن چکی تھی ۔

مادھوی سوچنے لگی ۔۔ سُریندر رائے ۔ یہ سُریندر رائے کون ہے ۔ یہ نام تو بہت ہی شناسا جان پڑتا ہے ۔ لیکن عادات و اخلاق تو بالکل ہی نہیں ملتے جُلتے ۔ اِس نام کو تو وُہ نہ جانے کتنے دِنوں سے دِل ہی دِل میں یاد کرتی آرہی ہے ۔ اُس کو آج پُورے پانچ سال ہو گئے ۔ کُچھ کُچھ بھُول چلی تھی ۔ لیکن آج بہت دِنوں بعد پھر یاد آ گئی ۔

اُس رات مادھوی ٹھیک طور پر سو بھی نہ سکی ۔ خواب بھی بڑے بڑے ڈراؤنے دِکھائی دیئے ۔ بڑے دُکھ اور تکلیف میں کٹی ۔ بار بار پُرانی یادیں انگڑائیاں لینے لگی تھیں ۔ بار بار آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں ۔ معصُوم سنتوش کمار نے اُسے ڈرتے ڈرتے کہا ۔

" مامی مَیں ماں کے پاس جاؤں گا " ۔ مادھوی خُود بھی کئی بار یہی سوچ چکی تھی ۔ کیونکہ جب یہاں کا اَن جل اُٹھ گیا تو کاشی میں رہنے کے سِوائے اور کوئی چارہ نہیں اور کوئی دُوسری راہ نہیں جس پر وُہ چل سکے ۔ اُس نے سنتوش کمار کے لئے بھی زمیندار سے ملاقات کرنے کا جو خیال کیا تھا وُہ اَب محض خیال ہی رہے گا ۔

پاس پڑوس کے لوگ منع کر رہے تھے ۔ علاوہ ازیں ایک اور فکر دامن گیر ہو گئی تھی ۔ ایک اور آفت اُٹھ کھڑی ہوئی تھی وُہ تھی اُس کے اپنے حُسن اور جوانی کی مشہوری ۔ مادھوی نے اپنے دِل میں کہا کہ میری قسمت ہی پھُوٹی ہے ۔ خوبصورتی وغیرہ کا جھگڑا کیا

آج کل شوہر پر شانتی کا پورا پورا رعب ہے اور پورا پورا حق ہے۔ اس کی ایک بھی بات سُریندر نہیں ٹالتا۔ دراصل سُریندر نے کبھی بات ٹال کر شانتی کے دِل کو تکلیف کبھی پہنچائی ہی نہیں۔ صرف چند بدمعاش دوست مل کر شانتی کو بڑا دُکھ دے رہے تھے آج کل بیوی کے نادرشاہی حکم سے سُریندر کا باہر کی مردانہ بیٹھک تک جانا بھی محال ہو گیا ہے۔ شانتی نے ڈاکٹر کی صلاح اور ہدایتیں لے کر اُن پر مکمل طور سے کاربند ہونے کی ٹھیک ٹھیک تیاری کر لی ہے۔

اُس وقت شانتی پتی کے ساتھ بیٹھی ہوئی لال فیتوں کے کاغذوں کے بنڈلوں کو باندھ باندھ کر رکھ رہی تھی۔ سُریندر نے ایک کاغذ دیکھتے دیکھتے سر اُٹھا کر یکایک پکارا۔ "شانتی!"

شانتی ابھی ابھی اُٹھ کر کہیں گئی تھی۔ دم بھر بعد واپس آ کر پوچھا۔ "کیا مجھے پکار رہے تھے؟"

سُریندر ـــــ "ہاں میں ذرا دفتر میں جانا چاہتا ہوں ـــــ؟"

شانتی ـــــ "نہیں۔ بتاؤ کیا چاہیئے۔ میں یہیں منگوائے دیتی ہوں ـــــ"

سُریندر ـــــ "مجھے کچھ بھی نہیں چاہیئے۔"

شانتی ـــــ "میں اُنہیں یہیں بُلوائے دیتی ہوں۔ آخر تم خود کیوں جاتے ہو اِس وقت ایسا کون سا کام آ پڑا ہے۔"

سُریندر ـــــ "یہی کہنا ہے کہ پہلی تاریخ سے اُن کو جواب دے دیا جائے گا۔ اب اُن کی اور ضرورت نہیں۔"

یہ سُن کر شانتی کو بڑی حیرت ہوئی۔ لیکن خوشی بھی کچھ کم نہ ہوئی۔ اُس نے مطمئن ہو کر پوچھا۔

"منیجر کا جُرم کیا ہے؟"

آج مادھوی کا ایکادشی کا برت تھا۔ لیکن سنتوش کے لئے تو ضرور ہی کہیں ناؤ روک کر رسوئی بنانی ہوگی اور اُسے کھانا کھلانا ہوگا۔

ملاّح نے کہا ——— "دستو پار کے گنج میں ناؤ لگانا ٹھیک رہے گا وہاں سب کچھ ملتا ہے۔"

خادمہ نے کہا ——— "ہاں کرو بھیّا دس گیارہ بجے تک لڑکے کو کھا لے جانا ضروری ہے۔"

سیاہ کالے بادل بدستور جھکے ہوئے تھے۔ لیکن بارش تھم گئی تھی ——— کھڑکی کے قریب رجسٹر اور دیگر کاغذات کے میز کے مقابل سُریندر ناتھ بیٹھا وصول۔ بقایا۔ اور جمع خرچ، بندوبست، معاملے اور مقدمات کی سب فائلیں لے کر ایک ایک کرکے اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنا سُننا ایک طرح سے ضروری بھی تھا ساتھ ہی یہ وقت گذرنے کا ایک بہترین ذریعہ بھی تھا۔ اِس کے لئے اُسے شانتی کے ساتھ کچھ جھگڑا بھی کرنا پڑتا تھا۔

وہ اُسے کبھی کرنے نہ دینا چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے بڑی بحث مباحثہ کے بعد سُریندر شانتی کو یہ سمجھا سکا تھا۔ کہ لکھنے پڑھنے سے آدمی کے دل کا وزن نہیں بڑھ جایا کرتا۔ اور اُس وقت اُسے سہارا دے کر وہاں سے باہر لے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لاچار ہو کر شانتی نے یہ بات مان لی اور وہ اِس کام میں بوقت ضرورت شوہر کی امداد بھی کر دیا کرتی تھی۔

اَب تک بدن میں بنا ہی ہُوا ہے۔ آج سات سال بیت گئے اِن باتوں کا اُسے خیال ہی نہ تھا۔ اِدھر خیال مرکوز کرانے والا کوئی تھا بھی نہیں۔ شوہر کی موت پر جب وُہ اپنے باپ کے گھر چلی آئی تھی تب سب نے اُسے "بڑی دیدی"۔ "بٹیا" "مائی" وغیرہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ اِن تمام عزّت و عقیدت کے منطابوں نے اُس کے دِل کو اور بھی وقت سے پہلے ہی بوڑھا بنا دیا تھا۔ حُسن اور جوانی کچھ نہیں جہاں اُسے بڑی دیدی کا کام کرنا ہوتا تھا۔ ماں کی مامتا اور سیوا کرنی ہوتی تھی۔ وہاں کیا اِس کبھی اِس رُوپ اور جوانی کا خیال بھی دِل میں آسکتا تھا؟ پہلے خیال نہ تھا۔ اَب وُہ متفکر ہو گئی۔ کچھ خوف سا محسُوس ہونے لگا۔ خاص کر اِس جوانی کے مُعاملہ سے۔ شرم کی ہنسی ہنس کر اُس نے دِل میں کہا ــــــ "یہاں کے آدمی اندھے ہیں یا جانور؟" لیکن مادھوی نے غلطی کی ــــــ سبھی کا دِل اُس کی مانند اکیس بائیس سال کی عُمر میں ہی بُوڑھا نہیں ہو جاتا"۔

گھر کے بالکل پاس ہی ندی کا گھاٹ تھا۔ مادھوی نے ملّاح سے کہا۔ "سومرا پور جانا ہے"۔ مادھوی نے سوچا ذرا چھوٹی بہن پرمیلا کو بھی دیکھتی چلوں"۔

گولا گاؤں سے دس میل کے فاصلہ پر سومرا پور میں پرمیلا کی شادی ہوئی تھی آج ایک سال سے وُہ سُسرال ہی میں تھی۔ پرمیلا پھر شائد کلکتہ جائے۔ لیکن اُس وقت مادھوی وہاں کہاں ہو گی۔ اِسی لئے اُس نے پرمیلا سے ایک بار مِل لینا ضروری سمجھا۔

صُبح سُورج کی پہلی کِرنوں کے ساتھ ہی ملّاحوں نے ناؤ کھول دی۔ لہروں کے ساتھ ساتھ ناؤ بہہ نکلی ہوا نخالف تھی اِسلئے ناؤ ہلکی چال سے بالسوں کے جنگل سے ہو کر کیٹلے نوک دار پودوں سے بچ کر سینٹھوں کے جھرمٹ کو پیچھے چھوڑتی ہُوئی دھیرے دھیرے چلی جا رہی تھی۔ بچے سنتوش کی خُوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا وُہ ناؤ میں چھپر کے اندر بیٹھا ہُوا وہیں سے ہاتھ بڑھا کر آس پاس کے درختوں کے پتّوں کو بڑی اُمنگ سے توڑنے لگا۔ ملّاحوں نے کہا کہ "ہوا کا زور اگر کم نہ ہوگا تو کل دوپہر تک ناؤ سومرا پور پہنچ سکے گی ــــــ"

سُریندر ـــــــ "اُنھوں نے جُرم کیا کیا ہے یہ تو میں اُبھی ٹھیک طرح سے نہ بتا سکوں گا۔ لیکن وُہ بڑی بدمعاشی کر رہے ہیں۔" اِس کے بعد عدالت کا سرٹیفکٹ اور دیگر کئی کاغذات دِکھا کر کہا۔

"یہ دیکھو گولا گاؤں میں رہنے والی ایک بیوہ عورت کا گھر بار، زمین جائداد سَب کچھ نیلام میں دُوسرے نام سے خرید لیا ہے۔ مجھ سے اِس کے متعلق ایک دفعہ بھی نہیں پُوچھا۔"

شانتی نے دُکھی ہو کر کہا! ـــــــ "آہ! بیوہ پر یہ ظلم کیا گیا ہے۔ یہ کام تو ٹھیک نہیں ہُوا۔ اچھا یہ تو بتاؤ اُس نے اُس بیوہ کی جائداد آخر نیلام کیوں کروائی۔"

سُریندر ـــــــ "اُس پر دس سال کا لگان باقی تھا۔ سُود اور اصل ملا کر کُل پندرہ سو روپے کی نالش کی گئی تھی۔"

رُوپے باقی ہونے کی بات سُن کر شانتی کے دِل میں متھرا بابُو کے تئیں غصّے اور نفرت کے جذبات کم ہو گئے۔ اُس نے ایک ہلکی سی مُسکراہٹ کیا تھ کہا۔ "تو پھر اِس میں منیجر کا کیا جُرم ہے کیا غلطی ہے۔ اِتنا تو وُہ چھوڑ بھی کیسے سکتے تھے؟"

سُریندر ناتھ خاموش ہو کر سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگا۔ شانتی نے پھر اُسی سِلسِلہ میں پُوچھا ـــ "کیا تم یہ سب کے سب روپے چھوڑ دینا چاہتے ہو؟ کیوں چھوڑ دو گے؟

سُریندر ـــــــ "چھوڑ نہ دُونگا تو اور کیا کروں گا۔ ایک بے چاری بیوہ کا گھر بار ہتھیا کر کیا اِسے نِکال باہر کر دُوں؟ تمھاری کیا رائے ہے؟"

دِل کی گہرائیوں سے نِکلے ہُوئے یہ الفاظ شانتی کے دِل میں کھب گئے، شرم سے پانی پانی ہو کر دُکھی دِل سے کہا۔ "نہیں کبھی نہیں۔ میں اُس بیوہ بہو کو گھر سے باہر کرنے کی رائے کبھی نہیں دے سکتی۔ علاوہ ازیں اگر تم رُوپے کسی کو دے بھی ڈالو تو میں کیوں راہ میں روڑے اٹکانے لگی ـــــــ؟"

سُریندر نے اب ہنسکر کہا ۔۔۔ "یہ بات نہیں نہیں ہے شانتی۔ میرے رُوپے کیا تمھارے رُوپے نہیں ہیں؟ میرا اور تیرا کیا الگ الگ ہے؟ اچھا جب میں نہیں رہُونگا تب تُم ۔۔۔۔۔۔"

شانتی ۔۔۔۔۔۔ (گھبراکر) "یہ کیا کہتے ہو؟ چُپ رہو، ایسی باتیں نہ کرو ۔۔۔۔"

سُریندر ۔۔۔۔ "اور کچھ نہیں شانتی۔ مَیں یہی پُوچھتا ہُوں کہ تُم کام کروگی نا؟ جسے میں پسند کرتا ہُوں۔ بولو نا ۔۔۔۔۔۔؟"

شانتی رونے لگی۔ کیونکہ اُسے معلُوم تھا کہ شوہر کی صحت ٹھیک نہیں۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "تُم ایسی باتیں کیوں کیا کرتے ہو ۔۔۔۔۔ ۔۔۔؟"

سُریندر ۔۔۔۔ "مُجھے بھلی لگتی ہیں۔ اِسی لئے۔ اچھا شانتی۔ میری آرزُو کیا ہے۔ یہ کیا تُم نہیں جان سکتیں ۔۔۔۔۔ ؟"

شانتی نے آنسُو پُوچھتے ہُوئے اثبات میں حامی بھردی۔

تھوڑی دیر بعد سُریندر نے پھر کہا ۔۔۔ "میری بڑی دیدی کا کا نام ۔۔۔!

شانتی نے آنکھوں سے اپنا آنچل ہٹاکر سُریندر کی طرف دیکھا۔

سُریندر نے کاغذ دکھاکر کہا! ۔ "یہ دیکھو بڑی دیدی کا نام ۔۔۔۔۔۔!"

شانتی ۔۔۔۔ "کہاں ہے ۔۔۔۔۔۔؟"

سُریندر ۔۔۔۔ "یہ دیکھو لکھا ہے ۔۔۔ "مادھوی دیوی۔ اِس کا گھر بار نیلام کردیا گیا ہے ۔۔۔۔۔۔"

دَم بھر میں شانتی نے سارا ماجرا سمجھ لیا۔ اُس نے کہا! "اِسی سے شاید تُم جائیداد واپس کر رہے ہو۔"

سُریندر ۔۔۔۔ (مسکراکر) "ہاں یہی بات ہے۔ اُن کا جو کچھ ہوگا وہ سب ضرور واپس کردُوں گا۔ سب کچھ۔ کوڑی کوڑی ۔۔۔۔۔۔"

مادھوی کی چرچا ہونے سے شانتی دِل میں کچھ دُکھی ہُوئی تھا شاید اُس کے من میں مادھوی کے تئیں کچھ جلن کا بیج اُگ آیا تھا۔

شانتی ــــ "وُہ تمہاری بڑی دیدی نہیں ہیں۔ صِرف مادھوی نام ہے اور نام کسی بھی ہو سکتا ہے۔ فقط۔ نام ہی سے تو یہ ــــــــــ"

سُریندر ــــ "تو کیا بڑی دیدی کے نام کی کچھ عزّت بھی نہ کرُوں ــــ"

شانتی ــــ "عزّت کرو۔ لیکن وُہ تو اِس عزّت سے باخبر بھی نہونگی۔ وُہ نہ جان پاوینگی"

سُریندر ــــ "وُہ تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن میں کیُوں نہ عزّت کرُوں؟ میں کِس طرح اِس نام کی بے عزّتی کر سکتا ہُوں ــــــ؟"

شانتی ــــ "نام کی کہتے ہو تو یہی نام کتنی عورتوں کا ہو سکتا ہے ــــ"

سُریندر ــــ "اچھا تم کیا دُرگا جی کا نام لکھ کر اُس کے اُوپر پاؤں رکھ سکتی ہو"

شانتی ــــ "چھی، چھی، چھی۔ یہ کیا کہتے ہو؟ دیوی دیوتاؤں کے بارے میں"

سُریندر ہنسنے لگا۔ بولا ــــــ "اچھا دیوی دیوتاؤں کا نام جانے دو۔ میں تم کو پانچ ہزار رُوپے دُوں گا اگر تُم میرا ایک کام کر دو ــــــ"

شانتی نے خوش ہو کر کہا ــــ "کون سا کام ــــــ؟"

دیوار پر سُریندر کی ایک تصویر لگی ہُوئی تھی اُسے سُریندر نے بیوی کو دکھا کر کہا ــــ "اِس تصویر کو اگر تُم ــــــــــ"

شانتی ــــ "کیا کہا ــــــــ؟"

اِسے چار براہمنوں کے ذریعے ندی کے کنارے جلا ــــــــ"

بجلی کا تار چھُو جانے سے آدمی کے جسم کا سارا خون جیسے دَم بھر میں جم جاتا ہے۔ جیسے سانپ کے کاٹنے سے مُنہ نیلا ہو جاتا ہے بالکل یہی یہی حالت شانتی کی بھی ہو گئی۔ اِس کے بعد آہستہ آہستہ کچھ کچھ ہوش و حواس ٹھیک ہو جانے پر تیکھی نظروں سے شوہر

کی طرف دیکھ کر وہ چپ چاپ نیچے اُتر گئی۔ شانتی نے اُسی وقت پروہت کو بُلا کر قاعدہ کیا تھا من کی شانتی کیلئے پوجا کا سامان ٹھیک کر کے طرح طرح کی منتیں مان کر عہد کیا کہ بڑی دیدی چاہے جو بھی بولیں ان کے بارے میں اب میں کوئی بات مُنہ سے نہ نکالونگی پھر کمرے میں جا کر کواڑ بند کر کے بہت دیر تک بیٹھی روتی رہی۔ زندگی میں آج تک ایسی کڑوی اور کڑوی بات اُس نے نہ سُنی تھی۔

سُریندر بھی اِدھر کچھ دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ دفتر میں مینجر سے مُنھ بھیڑ ہوتا۔ سُریندر نے چھوٹتے ہی یہ سوال کیا ——— "گولا گاؤں موضع میں کس کی جائیداد نیلام ہوئی ہے ———؟"

مینجر ——— "مرحوم رام رتن سانیال کی ہوگی ———"

سُریندر ——— "کیوں؟ ———؟"

مینجر ——— "دس سال سے مال گذاری نہیں ملی تھی ———"

سُریندر ——— "کہاں ہے کھاتہ دیکھوں تو ———"

متھرا بابو پہلے تو اِس غیر متوقع حکم سے چکرا گئے۔ پھر اُسی وقت سنبھل کر جواب دیا۔ "کاغذ اور کھاتے وغیرہ تو سب چمپہ میں ہی ہیں۔ وہاں سے لائے نہیں گئے ———"

سُریندر ——— "اچھا تو اُبھی لانے کے لئے آدمی بھیج دیجئے۔ کیا اُس لاوارث بیوہ براہمنی کے سر چھپانے تک کے لئے ذرا سی زمین بھی نہیں چھوڑی؟ شاید نہیں تو کہاں رہے گی بے چاری؟"

مینجر نے اب کی بار جرأت کا ثبوت دیا۔ "رہنے کی جگہ کیوں نہیں ہے۔ وہ اب تک جہاں تھی وہیں جا کر اب بھی رہے گی ———"

سُریندر ——— "ابتک کہاں رہ رہی تھی وہ ———؟"

مینجر ——— کلکتہ میں اپنے پتا کے گھر ———"

سُرنیدر ــــ "اُس کے پتا کا کیا نام ہے ــــــ؟"

منیجر ــــ "برج لال لہری ــــــــ"

سُرنیدر ــــ "اور اُس بیوہ کا نام ــــــــ؟"

منیجر ــــ "مادھوی دیوی ــــــــ!!!"

سَر جھکا کر سُرنیدر وہیں بیٹھ گیا۔ مالک کی یہ حالت دیکھ کر منیجر تو گھبرا گیا۔ اُس نے پُوچھا! ــــ "کیا ہُوا؟ بات کیا ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ــــ؟"

سُرنیدر نے اِن سوالات کا کُچھ جواب نہ دے کر ایک نوکر کو آواز دی۔ اُس کے آنے پر حُکم دیا۔ "جلدی جا کر سائیس سے کہو کہ ایک اچھے گھوڑے کی زین کس کر سواری کے لئے تیار کرے۔ یہاں سے گولا گاؤں کتنی دُور ہو گا؟ میں اِسی وقت وہاں جانا چاہتا ہُوں"

منیجر ــــ "کوئی دس کوس کے فاصلے پر ہو گا مالک ــــــ"

سُرنیدر ــــ (گھڑی دیکھ کر) "کوئی ایک بجے تک تو وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

گھوڑا آ گیا۔ سُرنیدر نے اُس پر بیٹھ کر پُوچھا ــ "کدھر جانا ہو گا؟"

منیجر ــــ "پہلے جنوب کی جانب اور پھر مغرب کی طرف سیدھی راہ ہے۔"

سُرنیدر نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا ہَوا سے باتیں کرنے لگا۔

اِدھر یہ خبر سُن کر شانتی بے حال ہو گئی۔ ٹھاکر دوارے میں جا کر ٹھاکر جی کے آگے اُس نے اِتنا سَر پٹکا کہ خُون بہنے لگا۔ وُہ بار بار کہنے لگی! "پربھو! تُمہاری یہی مرضی تھی کیا۔ تُم کو یہ سَب منظور تھا۔ کیا میرے دِل کے دیوتا پھر لوٹ کر آ سکینگے۔ کیا اُنہیں پھر بھر دیکھ پاؤں گی؟"

اُدھر دو سپاہی بھی گھوڑے دوڑاتے ہُوئے گولا گاؤں کی طرف تیزی سے چل دیئے۔ کھڑکی سے اُن کو جاتے دیکھ کر اُس کے مَن کو کُچھ شانتی ملی اور دِل کو ڈھارس بندھی۔ آنسُو پُونچھ کر بار بار کہنے لگی "دُرگا ماتا! میں دو بکرے چڑھاؤں گی۔ اپنی چھاتی کا خُون دُوں گی۔ جتنا چاہو۔ ماتا دُرگا جتنا چاہو۔ جب تک تُمہاری پیاس نہ بجھے۔ تب تک

اُتنا ہی اپنے دِل کا خُون تمہیں اَرپن کرُوں گی ۔ میری منو کامنا پُوری کرنا ـــــــــ"

گولا گاؤں ابھی دو کوس دُور تھا۔ گھوڑے کے کھُروں تک مُنہ کا جھین بہہ بہہ کر پہنچ چُکا تھا۔ گھوڑا دھُول اُڑاتا، نالے نالیاں اُور گڑھے پھلانگتا ہُوا بڑی تیزی سے سرپٹ دَوڑ رہا تھا۔ اُس نے جلدی پہنچنے کی کوشش میں جان لڑا دی تھی۔ سر پر آفتاب غصّے میں آگ برسا رہا تھا۔

گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے سُرِیندر کا جی مچلنے لگا۔ متلی ہونے لگی۔ ایسا جان پڑنے لگا جیسے پیٹ کے اندر کی ایک رگ کھنچ کر باہر نکل پڑے گی۔ دَم بھر کے بعد دو تین دفعہ تھوڑا تھوڑا خُون ہونٹوں سے بہہ کر ڈھلے ہُوئے کُرتے پر گر گیا۔ سُرِیندر نے ہتھیلی سے مُنہ سے آیا ہُوا خُون پُونچھ ڈالا۔ ایک بجے سے پہلے ہی سُرِیندر کا گھوڑا گولا گاؤں میں پہنچ گیا۔ سڑک کے کنارے دُوکان پر بیٹھے ہُوئے ایک دُوکاندار سے پُوچھا۔ "گولا گاؤں یہی نا؟"

دُوکاندار ـــــــ "جی ہاں ـــــــ"

سُرِیندر ـــــــ "رام رتن سانیال کا گھر کدھر ہوگا ـــــــ؟"

دُوکاندار ـــــــ "اُدھر۔ اُس طرف جایئے ـــــــ"

اُنگلی اُٹھا کر اُس آدمی نے جس طرف اِشارہ کیا تھا اُسی طرف گھوڑے کی لگام موڑ دی۔ کچھ منٹوں ہی میں گھوڑا سانیال بابُو کے گھر پر باہر ہی بیٹھک کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ دروازے پر ایک سپاہی بیٹھا تھا۔ مالک کو اچانک اِس طرح آتے دیکھ کر اُس نے اُٹھ کر سلام کیا۔

سُرِیندر ـــــــ "گھر میں کون ہے ـــــــ؟"

سپاہی ـــــــ "جی کوئی بھی نہیں ـــــــ"

سُرِیندر ـــــــ "جو عورت یہاں رہتی تھی وہ کہاں چلی گئی ـــــــ؟"

سپاہی ـــــــ "وُہ تو صُبح سویرے ہی کرایہ کی ناؤ پر بیٹھ کر جانے کہاں چلی گئیں۔"

سُریندر ـــــ "کس راستے سے ـــــــــــ؟"

سپاہی ـــــ "اِدھر کی جانب ناؤ گئی ہے سرکار ندی کے کنارے کنارے"

سُریندر ـــــ "گھوڑا دوڑنے کی جگہ بھی ہوگی ـــــــــــ؟"

سپاہی ـــــ "ٹھیک سے معلوم نہیں۔ شائد ـــــــــــ"

سُریندر نے گھوڑے کی لگام کو موڑا۔ اور گھوڑا پھر مالک کا اِشارہ پاتے ہی سرپٹ دوڑنے لگا۔ دو کوس کے قریب جانے پر آگے راہ دِکھائی نہ پڑی۔ گھوڑے کا چلنا مشکل ہوگیا تب گھوڑے کو وہیں چھوڑ کر سُریندر پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔ ایک بار اُس نے دیکھا۔ کُرتے پر کئی ایک خُون کے قطرے جم سے گئے ہیں۔ اور ہونٹوں سے خُون بہہ رہا ہے۔ ندی کے کنارے پہنچ کر اُس نے چلوؤں سے کئی بار پانی پیا اور مُنہ دھویا۔ اِس کے بعد پھر پُوری طاقت سے دوڑنے لگا۔ اُس وقت اُس کے پاؤں میں جُوتے بھی نہ تھے۔ سارے شریر میں کیچڑ اور اُس میں جگہ جگہ خُون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ سینے پر تو جیسے کسی نے پچکاری ماری ہو۔

دِن ڈوب چلا۔ پاؤں اب اُٹھتے نہ تھے۔ جیسے اُس نے اب کی بار ہمیشہ کے لئے سو جانے کا اِرادہ کر لیا ہو اور اِس میں آخری موت کی سیج پر زندگی کے آرام کی تمنائیں بڑی اُمنگ سے تیز تیز دوڑ رہا ہو۔ اُس کے بدن میں جتنی طاقت تھی وُہ بغیر کسی اُور خوف کے خرچ کرنے کے بعد اُس نے جیسے آخری سیج پر پناہ لینی تھی۔ پھر کبھی نہ اُٹھنا تھا۔

وُہ ندی کے اُس پار.... موڑ کے قریب.... ایک ناؤ ہی تو ہے۔ بینت کے پودوں کو ہٹاتی ہُوئی آگے بڑھنے کے لئے وُہ صاف کرتی چلی جا رہی ہے.... وُہ.... وُہ.... ہاں...... ہاں.... ناؤ ہی ہے.... وُہی ناؤ ہے.... سُریندر نے زور سے پُکارا۔ "بڑی دیدی".... گلا سُوکھ رہا تھا.... آواز تو نکلی نہیں.... لیکن کئی قطرے خُون کے نکل پڑے۔ پھر زور سے پُکارا "بڑی دیدی".... پھر وُہی حال ہُوا۔ خُون کافی بمقدار میں نکلا۔ کنارے پر اُگے ہُوئے پودے بار بار ناؤ کی راہ روک رہے تھے۔ اِسی لئے اِس بیچ میں سُریندر اُس کے قریب پہنچ گیا۔

اُس نے پھر پُکارا ..... "بڑی دیدی ـــــــــــــ !!!"

دِن بھر کے دُکھ اور جسمانی تکلیف کی وجہ سے مادھوی مُردہ سی ناؤ میں سو رہی سنتوش کے قریب ہی آنکھیں مُوندے پڑی تھی۔ یکایک "بڑی دیدی" کی پُکار سُن کر چونک اُٹھی ۔ یہ پُرانے جانے پہچانے لہجے میں اُسے کون پُکار رہا ہے ۔ ہاں وُہی آواز ..... مادھوی اُٹھ کر بیٹھ گئی ۔ باہر سَر نکال کر دیکھا .... ماسٹر صاحب ہی تو معلوم پڑتے ہیں سارا جسم مٹی اور کیچڑ سے لت پت ہو رہا ہے ۔

مادھوی نے اپنی خادمہ کو پُکار کر کہا "سو سپنا کی ماں ! سُنتی ہے ملاح سے کہدے جلدی سے کشتی کو روک دے ۔ یہیں پر کنارے پر لگا دے ـــــــــــ"

اُس وقت سُریندر میں رتی بھر بھی طاقت نہ تھی ۔ وُہ وہیں کنارے پر آہستہ سے ہاتھ پیر پھیلا کر لیٹ گیا ۔ سب مل کر سُریندر کو ناؤ پر اُٹھا لائے ۔ مُنہ اور آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مار مار کر ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے ۔ ایک ملاح سُریندر کو پہچانتا تھا ۔ اُس نے کہا ۔

"یہ تو لالتا گاؤں کے زمیندار ہیں ـــــــــــ"

مادھوی نے جھٹ سے اپنے گلے کا سونے کا ہار نکال کر ملاح کے ہاتھ میں دے دیا ۔ اور کہا "کیا آج رات کو لالتا گاؤں پہنچا سکتے ہو ؟ میں سب کو ایسا ہی ایک ایک ہار انعام میں دُوں گی ۔"

سونے کا ہار دیکھ کر تین طاقت ور جوان ملاح اُسی وقت رسّی لے کر پانی میں اُتر گئے ۔ اُنھوں نے کہا "ماتاجی ! رات چاندنی ہے اس لئے ہم صبح ہوتے ہوتے ضرور پہنچ جائینگے ۔"

شام ہو جانے کے بعد سُریندر کو ہوش آیا ۔ آنکھیں کھول کر وُہ مادھوی کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا ۔ اِس وقت مادھوی کے مُنہ پر پردہ نہ تھا ۔ فقط ماتھے کا کچھ حصّہ

آنچل سے ڈھکا ہُوا تھا۔ وہ گود میں سُریندر کا سر رکھے بیٹھی تھی۔

کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد سُریندر نے کہا! "تم میری بڑی دیدی ہو نا۔؟"

مادھوی نے آنچل سے سُریندر کے ہونٹوں پر لگے ہُوئے خُون کو اچھی طرح صاف کرتے ہُوئے آنکھیں پُونچھ کر کہا۔

"میں مادھوی ہُوں۔ مادھوی۔!!!"

سُریندر نے آنکھیں مُوند کر دھیرے سے کہا۔ "آہ! وُہی تو ——— !"

دُنیا بھر کا سکُون اور مسرتیں جیسے اُس کی گود میں چھپی ہُوئی تھیں۔ اتنے دنوں بعد سُریندر نے اُس شانتی اور سُکھ کو آج پالیا تھا۔ اُس کے خُون سے بھرے ہُوئے ہونٹوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

سُریندر نے کہا ——— "بڑی دیدی مجھے بڑی تکلیف ہے"۔

کشتی تیزی کے ساتھ جارہی ہے۔ اندر سُریندر کے چہرے پر چاند کی کرنیں ناچ رہی ہیں۔ خادمہ ایک ٹوٹا پنکھا لے کر آہستہ آہستہ ہُوا کر رہی ہے۔ سُریندر نے دھیرے سے پُوچھا۔ "کہاں جارہی تھیں"؟

مادھوی نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا ——— "پرمیلا کی سُسرال ———!"

سُریندر نے کہا! ——— "ابھی اِس طرح کوئی رشتہ دار کے گھر جانا ہے دیدی؟"

اپنے گھر میں اپنے سونے کے کمرہ میں، بڑی دیدی کی گود میں اپنا سر رکھے سُریندر اِس وقت بستر مرگ پر پڑا ہے۔ دونوں پاؤں کو گود میں رکھے شانتی اپنے آنسوؤں سے اُنہیں

چھو رہی ہے ۔ پٹنہ میں جتنے ڈاکٹر اور وید تھے سب مل کر کوشش اور محنت کرنے سے بھی خون بند نہیں کر پا رہے ہیں ۔ پانچ سال پہلے کا کینہ ناسور، آج مسلسل خون اگل رہا ہے ۔

ہم مادھوی کے دل کی بات نہیں کہہ سکتے ۔ ہم خود بھی اسے اچھی طرح نہیں جانتے ۔ اس وقت اسے پانچ سال پہلے کی بات یاد آ رہی ہے ۔ جب اس نے سریندر کو گھر سے باہر نکال دیا تھا ۔ اور پھر اسے واپس نہ لا سکی تھی ۔ لیکن پانچ سال بعد سریندر اس کو لوٹانے آیا ہے ۔

شام کے بعد چراغ کی روشنی میں سریندر ناتھ نے مادھوی کے منہ کو دھیان سے دیکھا ۔ پاؤں کے پاس شانتی بھی بیٹھی ہے ۔ کہیں وہ سن نہ لے ۔ اسی لئے مادھوی کے منہ کو اپنے قریب لا کر اس نے آہستہ سے کہا ——— "بڑی دیدی کیا تمہیں اس دن کی بات یاد ہے جب تم نے مجھے اپنے گھر سے نکال دیا تھا ؟ میں نے اس کا بدلہ لیا ہے ۔ تم کو بھی نکال دیا ۔ کیوں بدلہ پورا پورا لے لیا ہے نا ۔؟"

مادھوی بے ہوش سی ہو گئی ۔ اس کا سر جھک کر سریندر کے کندھے کے پاس آ گیا ۔ جس وقت اسے ہوش آیا اس وقت گھر میں رونے دھونے کا بھیانک کہرام مچا ہوا تھا ۔

چھوٹا بھائی

رام جتنا چھوٹا تھا۔ اُس سے کہیں زیادہ کھوٹا تھا۔ لوگوں کو پریشان اور شیطانی کی باتیں سوچنے میں وُہ اپنے گاؤں میں سب سے پیش پیش تھا۔ یہ اندازہ لگانا کہ اُس کی شیطنت، کا شکار کب۔ کون اور کس طرح ہوگا بے چارے گاؤں والوں کے لئے جانا قطعی ناممکن تھا۔

اُس کے بڑے بھائی کا نام شیام لال تھا۔ وُہ دونوں سوتیلے بھائی تھے شیام لال گاؤں کے زمیندار کی کچہری میں نوکری کرتا تھا۔ اُس کے پاس کھیتی باڑی کے لئے کچھ زمین تھی ایک تالاب، ایک باغیچہ اور ایک کھلیان بھی تھا۔ علاوہ ازیں دس بارہ چھوٹی ذات کے لوگ اُس کی زمین پر رہائش بھی رکھتے تھے۔ غرضیکہ گاؤں میں اس کی حیثیت اچھی سمجھی جاتی تھی۔

آج سے تیرہ سال کی بات ہے کہ نارائینی شیام لال کی بہو بن کر گھر میں آئی تھی۔ اِسی سال رام کی بیوہ ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ مرتے وقت وُہ اتنی بڑی گرہستی کا بوجھ اور اُس اڑھائی سال کے معصوم بچے کو تیرہ سال کی اپنی بہو نارائینی جو خود ہی ایک بچہ تھی کے کندھوں

پڑ ڈال گئی۔ نارائنی نے بھی بڑی ہوشیاری سے اتنا بڑا بوجھ سنبھالا اور بڑی ہوشیاری سے ابھی تک سارے کام کاج کو چلاتی آ رہی تھی۔ اس کے لئے ضرور اُس بڑھیا کی رُوح اِسے آشیرواد دے رہی ہو گی۔ رام سے نارائنی کو بے حد پیار تھا۔ کیونکہ اُسی نے رام کو بچپن سے پالا پوسا تھا۔ پرورش کی تھی۔ اور وہ رام کو اپنے بیٹے گوبند سے بھی زیادہ چاہتی تھی۔ رام بھی اپنی بھابھی کی عزت کرتا تھا اور اُس کے لئے دِل میں عقیدت رکھتا تھا۔ دُنیا میں اگر اُسے کسی کا خیال تھا تو فقط اپنی بھابھی کا۔

ایک تو برسات کا موسم اسپر بنگال کا گاؤں۔ ایسے میں تو ملیریا اور دیگر بیماریاں جی بھر کر اپنا ہاتھ دِکھاتی ہیں۔ ہمیشہ کے مانند اِس دفعہ بھی برسات میں رام کے گاؤں میں ملیریا نے کافی زور پکڑا۔ ایسے وقت میں گاؤں کے ڈاکٹر نیل منی سرکار کی خوب بن آئی آس پاس کے کئی گاؤں کو ملا کر وُہی ایک ڈگری یافتہ ڈاکٹر تھے۔ سب لوگ صبح سے لے کر شام تک اُنہیں گھیرے ہی رہتے۔ اِس دفعہ تو اُن کی فیس ایک روپے سے بڑھ کر دُو روپے ہو گئی تھی۔ اِس پر بھی اکتفا نہ کرتے ہُوئے اُنھوں نے کونین کی بجائے میدہ اور ارارو‌ٹ کی ہی پُڑھیا بنا کر بیچنا شروع کر دیں۔ بیچارے سادہ لوح دیہاتی اُن کی اِس کاروباری چال کو کیا سمجھتے۔ وُہ تو ڈاکٹر بابُو کو دیوتا سمجھتے تھے اور گڑ گڑا کر اُسے ہی دَوا سمجھ کر لے جاتے تھے۔ جو لوگ اَچھے ہو جاتے تھے وُہ تو ڈاکٹر بابُو کو فرشتہ کہتے اور جو بیچارے روگ سے جانبر نہ ہو کر موت کے آغوش میں چلے جاتے اُن کے عزیزو اقربا سمجھتے کہ بد قسمتی نے اُن پر حملہ کیا ہے۔ اِس میں ڈاکٹر بیچارہ کیا کر سکتا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر نیل منی کی چاندی ہی چاندی تھی۔ پانچوں اُنگلیاں گھی میں تھیں اور وہ ایسے موقعوں سے خُوب فائدہ اُٹھا کر دونوں ہاتھوں سے پیسہ بٹورتے تھے۔

اِس دفعہ نارائنی کو بُخار نے خُوب دبایا۔ آج روز سات روز ہو گئے۔ بُخار اُترنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ شیام لال بیچارے بہت متفکر تھے۔ رام بھی اپنی بھابھی کے پاس جاتا تھا

سے چڑھی ہُوئی آنکھیں اور تمتمایا ہُوا مُنہ دیکھ کر چُپ چاپ چلا آتا۔ اُس کے مخدوش دماغ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ جس سے اُس کی بھابھی کو بُخار سے نجات مِل جائے۔

گھر کی خادمہ نرت کا لی ڈاکٹر کو بُلانے گئی۔ اُس نے واپس آکر خبر دی کہ آج ڈاکٹر بابُو نہیں آئیں گے۔ کیونکہ اُنہیں دُوسرے گاؤں میں جانا ہے اور وہاں سے اُن کو چار روپے مِلنے ہیں۔

اُس کی بات سُنتے ہی شیام لال نے جھلّا کر کہا ——— "آئیں گے کیسے نہیں؟ کیا میں چار روپے نہیں دے سکتا؟ جا تُو اُنہیں ابھی لے آ۔ جان پیاری ہے یا پیسہ؟"

بستر پر پڑی نارائینی نے بھی یہ سُنا اور تکلیف سے بھری آواز میں شیام لال کی طرف اِشارہ کر کے کہا ——— "سُنتے ہو جی۔ آپ اِتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو ذرا سا تو بُخار ہے اُتر جائیگا کل ہی ڈاکٹر بابُو دیکھ جائیں گے۔ ایک دِن میں کون سا بڑا نُقصان ہو جائے گا۔———؟"

آنگن میں اَمرود کے درخت تلے تِنکے اِکٹھا کئے بیٹھا رام چڑیا پکڑنے کے لئے پنجرہ بنا رہا تھا۔ اُس کے کان میں بھی یہ آوازیں جا پہنچیں۔ ایک تو ویسے ہی بھابھی کی بیماری نے اُسے پریشان کیے رکھا تھا۔ دُوسرے ڈاکٹر بابُو کا آنے سے اِنکار سُن کر اُس کا سارا غُصّہ بھڑک اُٹھا۔ وہ اُٹھ کر دروازے تک آیا اور باہر جاتی ہوئی نرت کالی سے بولا ——— "تو ٹھہر جا پنیا میں خُود ڈاکٹر بابُو کو بُلانے جا رہا ہُوں۔"

دیور کی باتیں سُن کر نارائینی فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی اور شیام لال سے بولی۔ "رام کو روکیئے اُسے باہر نہ جانے دیجیئے" تب رام کو پُکارتے ہُوئے بولی ——— "اے رام! تُو واپس آجا بیٹا۔ تجھے میرے سر کی قسم۔ کِسی سے جھگڑا نہیں کرتے۔ آ اِدھر آ

اُسے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ اَب ڈاکٹر بابُو کی خیر نہیں اِسی لئے وُہ پریشان ہو رہی تھی۔
رام نے نارائینی کی آواز پر کان نہ دھر کر اُسی جھونک میں دروازے سے باہر نکل گیا۔ پانچ سال کا بھتیجہ گو بند اُس وقت بھی ایک طرف پنجرہ پکڑے بیٹھا تھا۔ اِس اُمید پر کہ ابھی چاچا باقی کا پنجرہ مکمل کریں گے۔ وُہ اپنے چاچا کا بڑا مُرید اور تابعدار تھا۔
نارائینی بے چاری سَر ہاتھ پر رکھے روتی روتی شوہر سے کہنے لگی "آپ نے اُسے روکا تک نہیں۔ اَب دیکھئے اَب وُہ کیا شرارت کر کے آتا ہے۔ کیا گُل کھِلا کر آتا ہے ......؟"
ایک تو ڈاکٹر کے نہ آنے سے شیام جھلّائے بیٹھے تھے۔ دُوسرے اِس منظر نے اُنہیں اور بھی بھڑکا دیا۔ کہنے لگے — "میں کیا کروں، جَب تُمہاری ہی بات اُس نے نہ سُنی تو میری کیا سُنے گا؟ تُمہارے سامنے تو وُہ مُجھے گنتی میں بھی نہیں لاتا ......"
"آپ نے میری ناظر اُس کا ہاتھ پکڑ کر روک کیوں نہیں لیا۔ اُس بے ہُودہ کی وجہ سے میں ایک لمحہ بھی سُکھ کی سانس نہیں لے پاتی۔ بِنیا اِدھر آ! اب کھڑی نہ رہ جا فوراً بھولا رام کو پیچھے بھیج دے۔ کہ وُہ اُسے سمجھا بُجھا کر واپس لے آئے ابھی رام زیادہ دُور نہیں گیا ہوگا۔ جا جا تُو جلدی جا ......!"
نرت کالی خادمہ بھولا کی تلاش میں چلی گئی۔ اِدھر رام نیل منی ڈاکٹر کے دروازے میں آ پہنچا۔ دواخانہ کیا تھا۔ مکان کے باہر ایک چھپّر ڈال کر چھوٹی سی بیٹھک بنائی گئی تھی۔ اُسی میں ایک کونے میں ایک ٹُوٹی پھُوٹی الماری تھی۔ جس میں بہت سی پُڑیاں اور شیشے کی بوتلیں تھیں۔ الماری کے سامنے ایک بہت پُرانا اور خستہ سا میز پڑا تھا جس کے ایک کنارے پر چھوٹا سا ٹُوٹا ترازو پڑا ہُوا تھا۔ رسّی باندھ کر کام کے

لائق بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نیل منی سرکار ایک کرسی پر میز کے سامنے بیٹھے ترازو میں دوائیوں کا وزن کر رہے تھے۔ پانچ چھ مریض زمین پر بیٹھے ڈاکٹر بابو کو دوائیوں کا وزن کرتے ہوئے منہ بنا کر دیکھ رہے تھے۔

رام کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑا یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ڈاکٹر سے پوچھا "ڈاکٹر بابو میری بھابھی کا بخار کیوں نہیں اترتا؟"

ڈاکٹر نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا ——— "بخار نہیں اترتا میں کیا کروں۔ دوا تو دے رہا ہوں ———"

رام ——— "دوا کیا دیتے ہیں مٹی دیتے ہیں۔ کونین کے بدلے۔ سڑے میدے کی پڑیا کیا کبھی بخار اتار سکتی ہے؟"

رام کی اس تیکھی بات کو سن کر ڈاکٹر بابو کا پارہ ایک دم ساتویں آسمان پر جا چڑھا۔ مارے غصے کے وہ کچھ بول نہ سکے۔ صرف لال لال آنکھوں سے اس کو گھورتے ہی رہ گئے۔ انہیں خواب میں بھی اس بات کی توقع نہ تھی کہ اتنی بڑی بات کوئی اس سادگی سے ان کے منہ پر کہنے کی جرأت کر سکے گا۔

تھوڑی دیر بعد وہ گرجتے ہوئے بولے ——— "تم لوگ جب یہ جانتے ہو کہ میں سڑے میدے کی پڑیاں دیتا ہوں تو مجھ سے دوا لینے ہی کیوں آتے ہو؟ اس کے علاوہ تمہارے بھائی شیام لال میرے پاؤں پڑ کر مجھے لینے کیوں آتے ہیں؟"

رام ——— "اس جگہ کوئی دوسرا ڈاکٹر نہیں ہے اسی لئے آپ کو بلایا جاتا ہے اگر کوئی دوسرا ڈاکٹر ہوتا تو آپ کو بلانا تو کہیں دور رہا آپکی کوئی شکل دیکھنے بھی نہ آتا۔"

سب لوگ پتھر کی مورتیوں کے مانند بیٹھے چپ چاپ سن رہے تھے۔ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ آج ڈاکٹر بابو کی خیر نہیں ہے۔ رام نے ایک دفعہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے ڈاکٹر بابو سے کہا ——— "تم لوگ چھوٹی ذات کے ہم برا ہمن

کی عزت و توقیر کو کیا سمجھو۔ اسی لئے جھٹ زبان سے نکال دیا کہ میرا بھائی تمہارے گر کر بلانے کیوں آتا ہے۔ میرے بھیا کو کسی کے پاؤں گرنے کی عادت نہیں ہے۔ یہاں آتے وقت بھابھی نے اپنے سر کی قسم دے دی تھی نہیں تو ابھی ہی چھوٹے منہ کو اتنی بڑی بات کہنے کا مزا بتا دیتا۔ لیکن ایک بات کہے جاتا ہوں ——— "ڈاکٹر بابو یاد رکھئے گا اچھی دوائی لے کر ابھی بھابھی کو دیکھنے چلے آیئے۔ اگر آج بھابھی کا بخار نہیں اترا تو اس کا نتیجہ بُرا ہوگا۔ یہ سامنے جو آم کے درخت لگا رکھے ہیں ان کی ایک ڈال بھی رات کو نہ بچے گی۔ سب کلہاڑی سے ٹکڑے ٹکڑے کٹ جائیں گے۔ اس کے علاوہ کل آکر آپ کی تمام شیشیاں اور بوتلیں بھی چُور چُور کر جاؤں گا۔ اتنا کہہ کر رام دواخانہ سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نیل منی سرکار دم بخود رہ گئے۔ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ رام کی باتیں اُن کے دماغ میں گونجتی رہ گئیں۔ وہ رام کے نام سے اچھی طرح واقف تھے۔

پیچھے بیٹھے ہوئے ایک مریض نے ہمت کر کے ڈاکٹر بابو سے کہا ——— "ڈاکٹر بابو اب خیر نہیں۔ بیکار سوچ کر دیر نہ کیجئے۔ کہیں اچھی دوا چھپا کر رکھی ہو تو فوراً لے کر چلے جایئے۔ آپ نہیں جانتے کہ وہ رام ہے۔ جو کہتا ہے اُسے کر کے ہی چھوڑتا ہے۔"

ڈاکٹر ——— "میں تھانے میں جا کر اس بات کی ابھی رپورٹ کردوں گا۔ تم سب اس واقعہ کے گواہ ہو۔ تمہیں داروغہ کے سامنے شہادت دینی ہوگی۔"

اُسی بوڑھے نے جس ڈاکٹر بابو کو صلاح دی تھی جواب دیا ——— "گواہی کون دے گا بابو؟ میرے کان تو کونین کھاتے کھاتے سُن ہو چکے ہیں۔ رام کیا کہہ گیا ہے اُسے میں ٹھیک سے سُن بھی نہ سکا۔ اور پھر داروغہ بھی کیا کرے گا؟ رام دیکھنے ہی میں چھوٹا ہے لیکن اس کے پاس بچوں کی جو فوج ہے وہ چھوٹی نہیں۔ جب سب مل کر چھپر میں آگ لگا دیں گے تو تھانے سے کوئی نہیں آئے گا۔ اور نہ ہی اس کا پتہ لگ سکے گا کہ آگ کس نے لگائی ہے۔ ہم لوگ گواہی نہ دے سکیں گے۔ اور نہ ہی ہم لوگ بیکار میں اُس

کے خلاف جاکر نقصان ہی کروانا چاہتے ہیں۔ ہم لوگ اُس سے بہت ڈرتے ہیں۔ بھلائی تو اسی میں ہے کہ وہ جو کچھ کہہ گیا ہے اُسی پر عمل کیجئے۔ اچھا ڈاکٹر بابو ایک دفعہ میری نبض تو دیکھئے۔ بخار ہے یا نہیں۔ مارے بھوک کے طبیعت بہت پریشان ہے۔ دو ایک روٹی کھا سکتا ہوں کہ نہیں؟"

ڈاکٹر بابو تو یوں ہی اندر جل کر خاک ہو رہے تھے۔ اس بوڑھے کی نبض دیکھنے کی بات سُن کر اور بھی بھڑک اُٹھے۔ کہنے لگے ——— "جب تم لوگ میری طرف سے گواہی ہی دینا نہیں چاہتے تو کیا یہاں میری صورت دیکھنے کو بیٹھے ہو۔ میں کسی کا بھی ہاتھ نہیں دیکھوں گا مَر جاؤگے تو بھی کسی کو دوا نہیں دوں گا۔ تم لوگ چلے جاؤ یہاں سے۔"

وہ بوڑھا اپنی لاٹھی اُٹھا کر کھڑا ہوا اور چلتے چلتے بولا ——— "ڈاکٹر بابو بے کار غصے مت ہوجیئے۔ اِس میں کسی کا بھی قصور نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ رام بہت بڑا شیطان ہے اُس سے سبھی خوف کھاتے ہیں۔ مجھے جاکر ابھی اس سے اطلاع کردینا ہوگا نہیں تو کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ ہمیں لوگوں نے آپ کو تھانہ جانے کی صلاح دی ہے۔ قریب ایک بیگھہ زمین میں بینگن لگائے ہیں۔ اِس سال ہوا بھی خوب ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج رات کو اُس کی ہندو فوج شبخون مار دے اور میں غریب بے چارہ بے موت ہی مارا جاؤں۔ ڈاکٹر بابو کبھی اور دن تھانہ چلے جایئے گا۔ آج تو ایک شیشی بڑھیا دوا کی لے کر اُسے منا آیئے۔"

بوڑھا تو اتنا کہہ کر چلتا بنا اور جو باقی لوگ وہاں بیٹھے تھے ڈاکٹر کا رُخ ٹیڑھا دیکھ کر ایک ایک کرکے دواخانہ سے نکلنا شروع ہو گئے۔ نیل منی ڈاکٹر بھی ایک لمبی سانس لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور یہ کہتے ہوئے اندر چلے گئے کہ اِس جہان میں بھلائی کا بدلہ بُرائی ملتا ہے اِس لئے کبھی بھی کسی کے ساتھ بھلائی نہ کرنی چاہیئے۔"

رام کی بھابھی نارائینی کھڑکی کی طرف ٹکٹکی لگائے آدھی رات سے رام کا انتظار کر رہی تھی۔ رام نے مکان کے اندر آ کر آنگن سے ہی آواز لگائی ——— "گو بز آ کر ہم لوگ

پنجرہ بنا رہیں۔ چاچا کی آواز سن کر نارائینی کے پاس لیٹا ہوا گوبند تو جھٹ سے اُٹھ کر آنگن کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن نارائینی نے رام کو پکارا ــــ "رام اِدھر آ ــــ!"

پنجرے میں ایک سلائی لگا کر کہتے ہوئے رام نے جواب دیا ــــ "ابھی نہیں آ سکتا کام کر رہا ہوں ــــ"

غصے میں نارائینی چلائی ــــ "میں کہتی ہوں ابھی اِدھر آ۔"

پنجرے کی سلائیوں کو گوبند کے ہاتھوں میں تھما کر رام آہستہ سے بھابھی کے کمرے میں آ کر تخت پر بچھے ہوئے بچھونے کی پائینتی پر بیٹھ گیا۔

نارائینی نے پوچھا ــــ "ڈاکٹر بابو سے ملاقات ہوئی؟"

رام ــــ "ہاں ــــ"

نارائینی ــــ "اُن سے کیا کہا ــــ؟"

رام ــــ "آنے کے لئے کہہ دیا ہے ــــ"

نارائینی کو اِس بات پر یقین نہ آیا۔ وہ جانتی تھی کہ رام اتنا سیدھا نہیں ہے۔ اُس نے پھر پوچھا ــــ "صرف آنے ہی کے لئے کہا ہے ــــ اور کچھ تو نہیں کہہ آیا؟"

رام خموشی سے آنکھیں جھکا کے بیٹھا رہا۔ اور کچھ نہ بولا۔

نارائینی ــــ "ارے بول نا! ڈاکٹر بابو سے کیا کہہ آیا ہے ــــ؟"

رام ــــ "میں نہیں بتا سکتا ــــ"

اسی دوران نرتی کالی نے کمرے میں آ کر خبر دی کہ ڈاکٹر مریض کو دیکھنے آئے ہیں۔ نارائینی جھٹ سے موٹی چادر اوڑھ کر کروٹ لے کر لیٹ گئی۔ رام اُسی وقت باہر نکل گیا۔ اِس کے بعد ہی ڈاکٹر کو ہمراہ لے کر شیام لال اندر آ گئے۔ نبض وغیرہ دیکھ اور مناسب دوا تجویز کر کے دے کر نارائینی کو مخاطب کر کے ڈاکٹر نیل منی نے کہا ــــ "بہو تم ہی بولو۔ کیا بخار کا چڑھنا اُترنا ڈاکٹر کے ہاتھ میں ہے۔ تمہارے دیور نے تو مجھے فقط آج ہی کا دن دیا ہے کہ

اگر بخار اُتر گیا تو ٹھیک ہے ورنہ میرے دواخانہ کو وہ جلا کر خاک کر دے گا۔"

نارائینی نے بے حد شرمندہ ہو کر کہا ــــــ "وہ ایسے ہی کہتا پھرتا ہے آپ بالکل فکر نہ کریں ــــــ"

ڈاکٹر ــــــ "سب لوگ جو کہتے ہیں کہ اُس کی ایک بندر فوج ہے اور وہ لوگ جو کہتے ہیں کر کے ہی دَم لیتے ہیں۔ اِسی سے بڑا خوف محسوس ہوتا ہے بیٹی۔ ہم لوگ تو صرف دَوا دے سکتے ہیں۔ مرض کا اُچھا ہونا یا نہ ہونا تو بھگوان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اِس مُعاملے میں تو ہم لوگ بالکل ہی لاچار ہیں۔ تم خود ہی عقلمند ہو اور اِس بات کو سمجھتی ہی ہو۔"

نارائینی ــــــ "ایسا معلُوم ہوتا ہے کہ یہ شیطان لڑکا ایک دِن ضرُور جیل جائے گا۔ اور ساتھ ساتھ ہمیں بھی وہاں کی ہوا کھلائے بغیر باز نہ آئے گا۔

آج نیل منی ڈاکٹر بابُو نے اپنی خواب گاہ میں رکھے ہُوئے ایک خاص بکس میں چھپائی ہُوئی خالص اور اصلی اور تازی کونین نکال لایا تھا۔ معلُوم ہوتا ہے کہ رام کے خوف کا بھُوت بُری طرح ڈاکٹر بابو کے سر پر سوار ہو گیا تھا۔ واپس جاتے وقت شیام لال اُن کی فیس چار روپے اُن کے ہاتھ پر رکھنے لگا تو زبان نکال کر کانوں پر ہاتھ رکھتے ہُوئے اُنھوں نے کہا ــــــ "نہ شیام بابو غضب ہو جائے گا۔ میری فیس تو صرف ایک روپیہ ہے۔ میں چار روپیہ کیسے لے سکتا ہُوں؟ زیادہ فیس چارج کرنا میری عادت نہیں۔ پیسہ تو چار دِن کی مایا ہے۔ ڈھلتی دھُوپ کی چھایا ہے۔"

اَبھی دو ہی دِن پہلے اِسی جگہ پر نیل منی ڈاکٹر نے اُن سے ایک روپے کے دو روپے فیس کی صُورت میں چارج کرنے میں ذرا بھی آج کی مانند ہچکچاہٹ ظاہر نہ کی تھی ــــ وُہی ڈاکٹر نیل منی آج رام کی بدولت سر پر پاؤں رکھے فوراً دوڑتے چلے آئے۔ اور اپنی فیس بھی چار روپے کے بجائے ایک ہی روپیہ لی۔ اور اِس میں بھی شک نہیں کہ اُنھوں نے دَوا اصلی ہی دی ہو گی۔

کونین کی ایک ہی پُڑیا نے صبح تک نارائینی کا بُخار ہلکا کر دیا۔ اور دو دن ہی میں وُہ تندرست ہو کر پہلے کی مانند اپنی گرہست کی گاڑی کو چلانے لگ گئی۔

تقریباً دو مہینے بعد ایک روز جب نارائینی ندی میں نہا رہی تھی۔ تو ایک عورت نے اُس سے رام کی نئی شیطانی کا ذکر کیا۔ جسے سُن کر وُہ دِل ہی دِل میں پریشان ہوئی۔ جلدی سے نہا کر کمر پر گھڑا رکھ گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ رسوئی گھر میں گھڑا رکھ کر جاتے ہُوئے نرت کالی سے اُس کی مُلاقات ہو گئی۔ اُسے دیکھتے ہی نارائینی نے پُوچھا۔ "بیٹیا۔ وُہ بندر کہاں ہے؟"

گھر کے سب افراد اِس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ بندر سے کیا مُراد ہے اور نارائینی کیسے بندر کہتی ہے۔

بیٹیا نے رام کی طرف اُنگلی سے اِشارہ کرتے ہُوئے کہا ——— "ماں جی چھوٹے بابُو اُس درخت کے نیچے بیٹھے پتنگ بنا رہے ہیں۔"

نارائینی نے رام کو آواز دی ——— "او رام اِدھر آ۔ تیرے مارے تو ناک میں دَم آ گیا ہے۔ تُو نہ گھر میں ہی نہ چین سے بیٹھنے دیتا ہے اور نہ ہی تیری وجہ سے باہر ہی شانتی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی تیرا ہی گُن گا رہا ہوتا ہے۔"

نارائینی نے اُس سے پُوچھا ——— "کیوں رے؟ یہ سامنتا لوگوں کے کھیت میں کھیروں کی بیل کو ن برباد کر آیا ہے ———؟"

رام ——— "کیا اُن لوگوں نے مجھے دیکھا ہے؟"

نارائینی ـــــــ "گو اُن لوگوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ لیکن میں تو جانتی ہُوں نا کہ یہ کس کی کرتُوت ہے۔ بول کیوں اُن کے کھیروں کا ستیاناس کرایا ہے ـــــــ؟"

رام ـــــــ "اُس بُڑھیا نے میری بے عزّتی کیوں کی ہے ـــــــ؟"

نارائینی ـــــــ (غصّہ سے) "بے عزّتی کی بات پیچھے ہو گی۔ میں تیری سب کارستانی جانتی ہُوں۔ پہلے یہ بتا کہ تُو نے چوری کیوں کی ـــــــ؟"

رام نے بے حد غصّہ اور جوش میں بھر کر کہا ـــــــ "چوری کبھی نہیں۔ کیا ایک ٹکڑا کھیرا لے لینے سے کہیں چوری ہوتی ہے ـــــــ؟"

نارائینی نے اَور بھی بھڑکتے ہُوئے کہا ـــــــ "ہاں ہوتی ہے بندر۔ اِتنا بڑا ہو گیا ہے ابھی تک عقل نہیں آئی۔ یہ بات تو چھوٹا بچّہ بھی جانتا ہے کہ چوری کِسے کہتے ہیں؟ تُو آج کل بڑا خراب ہوتا جارہا ہے۔ کھڑا رہ آج دِن بھر ایک پاؤں پر یہیں۔ اِسی جگہ۔ آج مجھے ضرور سزا دُوں گی ـــــــ"

اُس مکان میں سب سے چھوٹا گوبند تھا جو رام کا بایاں ہاتھ تھا۔ چوبیس گھنٹے وہ رام کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اَور رام کے سب کاموں میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ رام کے کہنے سے اب تک وہ پتنگ پکڑے بیٹھا تھا۔ لیکن گرما گرمی کی بات سُن کر وہ اُسے چھوڑ ماں کے پاس چلا آیا۔

گوبند نے رام کو اِدھر اُدھر کرتے دیکھ کر جھٹ سے کہا۔ ـــــــ "چاچا اب ٹال مٹول سے کام نہ چلے گا۔ ماں کو سب معلُوم ہو گیا ہے اَب پاؤں سے اِس طرح کھڑے ہو جاؤ" اِتنا کہہ کر اُس نے ایک پاؤں اُٹھا کر کھڑا ہونے کی ترکیب بتا دی۔

رام نے چڑ کر گوبند کے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ اور پیچھے پیٹھ پھیر کر ایک پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

نارائنی ہنسی کو بمشکل دبا کر گوبند کو گود میں اُٹھا کر رسوئی گھر میں چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُس نے آکر دیکھا کہ رام اُسی طرح ایک پاؤں پر کھڑا سسک سسک کر رو رہا ہے اور بار بار

دھوتی کے پلّو سے آنکھیں پونچھ رہا ہے۔

نارائینی نے کہا ——— "اچھا جا ہو گیا۔ اب پھر ایسی بدمعاشی نہ کرنا"۔

رام نے کچھ سنا ہی نہیں۔ غصّہ میں وہ اسی طرح ایک پاؤں پر کھڑا آنکھیں پونچھتا رہا ———

نارائینی نے اُس کے نزدیک آکر پیار سے اُس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگی۔ لیکن رام نے جھٹک کر اُس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ نارائینی پھر ایک بار اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ لیکن پہلے ہی کی مانند اِس بار بھی اُس کا ہاتھ جھٹک دیا اور باہر بھاگ گیا۔

قریب ایک گھنٹہ بعد نرت کالی اُس کی کھوج میں نکلی۔ اُس نے دیکھا کہ رام برآمدے کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھا ہے۔ اُس نے کہا ——— "چھوٹے بابو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو سکول جانے کا ہوش نہیں۔ کچھ خبر بھی ہے کہ کیا بج چکا ہے؟ چلئے مال جی ناراض ہو رہی ہیں"۔

رام نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایسی شکل بنائی کہ جیسے اُس کی کوئی بات سُنی ہی نہیں۔ اور اُسی طرح سے اُس کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے بیٹھا رہا۔

اُسے کچھ جواب دیتا نہ پاکر نرت کالی اُس کے نزدیک آئی اور بولی ——— "چھوٹے بابو مال جی نے کہا ہے کہ اسکول کا وقت ہو گیا ہے۔ جلدی نہا دھو کر کھانا کھا لیجئے ———"

رام نے اُسے لال لال آنکھیں دکھا کر جھاڑتے ہوئے کہا ——— "تو چلی جا یہاں سے اپنی صورت بھی مت دکھا"۔

نارائینی ——— "لیکن مال جی نے کیا کہا ہے۔ اُسے بھی سُنا ہے آپ نے؟"

رام ——— "میں کچھ بھی نہیں سُننا چاہتا۔ نہ تو آج نہاؤں گا اور نہ کھاؤں گا۔ میں کچھ بھی نہیں کروں گا آج ———"

نارائینی ——— "اچھی بات ہے بس ابھی جا کر مال جی سے کہتی ہوں۔

اِتنا کہہ کر نرت کالی واپس جانے کے لئے مُڑی۔

رام فوراً اُٹھا اور گندے جوہڑ میں ایک ڈبکی لگا کر اُسی طرح بھیگے کپڑے اور بھیگا سَر
سَر لیے آنگن میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اِس بات کی خبر فوراً ہی نرت کالی نے نارائینی کو پہنچائی۔
وُہ بے چاری بے چین ہو اُٹھی۔ فوراً رسوئی گھر سے نکل کر آنگن میں آئی اور اپنے آنچل سے
اُس کا بدن اور سَر پونچھتی ہوئی رام سے کہنے لگی۔

"ارے پگلے یہ تو نے کیا کیا۔ اُس گندے جوہڑ میں تو کوئی پاؤں بھی نہیں دھوتا ہے اور
تو سَر اور پاؤں تک نہا آیا۔ بیمار پڑ جائے گا تو میری ہی جان پر آفت آئے گی نا؟" اِتنا کہہ کر
اُس نے رام کے بھیگے کپڑے اُتارے۔ نرت کالی سے سُوکھے کپڑے لے کر پہنا دیئے بڑے
دُلار سے وُہ اپنے ساتھ چوکے میں لے گئی۔ اور چوکی پر بٹھا کر اُس کے سامنے بھوجن پروس
کر رکھ دیا۔ لیکن رام نے تھالی میں ہاتھ تک نہ لگایا۔ اور پتھر کی مُورتی کے مانند سَر جھکائے
بیٹھا رہا۔

نارائنی اُس کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ اُس نے بڑے پیار سے اُس کے
سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— "رام! تو تو بڑا راجہ بیٹا ہے نا؟ ابھی تو اپنے ہاتھ
سے کھا لے۔ رات میں خود تجھے اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی۔ تو خود دیکھ لے ابھی میری رسوئی
تیار نہیں ہوئی ہے۔ صبح سویرے کے گئے ہوئے تیرے بھیّا کا آنے کا وقت ہو گیا ہے۔
اب تک کھانا تیار نہ ہونے سے مجھ پر ناراض ہوں گے نا؟ تو کھا لے بیٹا اب ———!"
رام بڑے تابعدار بچّے کے مانند بھابھی کے اتنا کہنے پر چُپ چاپ کھانا کھا کر اُٹھ
گیا۔ اور فوراً کوٹ پہن اور بغل میں بستہ دبا سکوُل کو روانہ ہو گیا۔
نارائنی کی یہ سب باتیں نرت کالی دیکھ رہی تھی۔ رام کے چلے جانے کے بعد کہنے
لگی ——— "ماں جی تمہاری ہی وجہ سے یہ رام اِتنا بگڑ گیا ہے۔ اِتنا بڑا ہو گیا ہے لیکن
ابھی تک گود میں بیٹھ کر تمہارے ہاتھ سے کھانا کھانے کی ضد کرتا ہے۔"
نارائینی نے ہنس کر کہا ——— "اگر میں اُس سے رات کو کھلا دینے کی بات نہ کہتی

تو وُہ اُبھی ہرگز نہ کھاتا ۔ چاہے سارا دِن گنگ کھاتا ۔ یُونہی گردن جھکائے بیٹھا رہتا۔"

نرتن کالی ——— " نہ کھاتا تو نہ سہی ۔ جب پیٹ جلتا تو خُود ہی مانگ لیتا ۔ اتنا بڑا ہو گیا لیکن ......"

نرتن کالی کی باتیں سُن کر نارائینی بے چین ہو اُٹھی ۔ اور کہنے لگی ——— " تم لوگ تو اُس کی عُمر ہی دیکھتے ہو ۔ اُبھی وُہ بچہ ہی ہے ۔ بڑا ہو گا تو سمجھ جائے گا ۔ تب تو خُود ہی اُسے یہ بچپنا کرنے میں شرم محسوس ہو گی نہ کبھی گود میں بیٹھنے کا ہی ذکر کرے گا نہ کھلانے کو ہی کہے گا۔"

نرتن کالی نے اندر ہی اندر ناراض ہو کر کہا ——— " ماں جی میں تو بھلے ہی کو کہتی ہُوں ۔ نہیں تو کیا مجھے اُس سے کوئی دُشمنی ہے؟ اگر بارہ تیرہ سال کی عُمر میں شعُور اور عقل نہ آئی تو کیا بُوڑھے ہونے پر آئے گی ۔ اُبھی سے ہی آہستہ آہستہ اُس کی عادتیں نہ سُدھاری گئیں تو بعد میں پچھتانا ہو گا۔"

اِس دفعہ نارائینی کا پارہ گرم ہو گیا ۔ وُہ رام کو بے حد چاہتی تھی ۔ دو سروں کی بات کا تو کہنا ہی کیا ۔ وُہ شیام لال تک کو بھی رام کو کچھ نہ کہنے دیتی تھی ۔ اِس بات پر وُہ نرتن کالی سے ناراض ہُوئی ۔ کہنے لگی ——— " سب آدمیوں میں شعُور اور عقل آنے کا کوئی مقررہ وقت نہیں ہے ۔ کوئی تو دو تین سال پہلے فرائض اور ذمہ داریوں کو سمجھنے لگ جاتا ہے ۔ اور کسی کو دو تین سال کی دیر لگتی ہے ۔ چاہے اُس میں عقل ہو یا نہ ہو کسی کو اِس سے کیا لینا دینا ہے ۔؟ میرا لڑکا ہے میں خُود اُس سے سمجھ لُوں گی ۔ پھر تم کیوں اُس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے رہتے ہو؟"

نرتن کالی ——— " یہ تو آپ ہی کی غلطی ہے ۔ اُس کی شرارتیں کس قدر بڑھتی چلی جا رہی ہیں ۔ یہ تو آپ سے بھی چھپا نہیں ۔ گلی محلے والے بھی کہتے ہیں کہ یہ سب آپ ہی کی وجہ سے ہے ۔"

نارائینی ——— " گلی محلے کے لوگ تو لاڈ ہی دیکھتے ہیں اور سر چڑھا لیا کہنا شروع کر دیتے ہیں ۔ اُس کو شرارتوں کی کس طرح سزا دیتی ہُوں اِس پر کسی کی آنکھ نہیں ٹھہرتی ۔ پھر تُو تو پاس پڑوس کی نہیں ہے ۔ تُو نے خُود ہی دیکھا ہے کہ صبح گھنٹہ بھر وُہ ایک پاؤں پر کھڑا رہتا رہا

ہئے۔ اس کے بعد اُس جوہڑ میں جاکر نہا آیا تھا۔ اگر کہیں بُخار نے آدبوچا تو مجھے ہی جھیلنا ہوگا گلی محلّے والے جھانکنے بھی نہ آئینگے۔ تُو ہی بتا کہ کیا اتنی سزا کم تھی جو تیرے کہنے پر اُسے بھوکا ہی سکول بھیج دیتی؟ اب تو یہ گھر اور باہر کی چخ چخ برداشت نہیں پاتی۔"

اِتنا کہہ کر نارائینی خاموش ہوگئی۔ رات بھی انہی باتوں کو لے کر شیام لال سے گھنٹوں تکرار ہو چکی تھی۔ وُہ اِس وقت بہت دُکھی تھی۔ پھر اِسی بات کے اُٹھ جانے پر اُسکے دِل کا درد آنکھوں کی راہ سے اُمڈ پڑا اور نارائینی اپنے آنچل سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ برت کالی کو اِس بات کا خیال نہ تھا کہ اِنہی باتوں کو لے کر وُہ رات کو بھی دُکھی ہو چکی ہے، نہیں تو آج وُہ اِس مسئلہ پہ گفتگو ہی نہ کرتی۔ وُہ کافی عرصہ سے اِس گھر میں کام کرتی چلی آرہی تھی۔ نارائینی اُس کے سامنے ہی بہو بن کر اِس گھر میں آئی تھی اور وُہ اِس کو اپنی بیٹی ہی کی مانند پیار اور محبّت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ نارائینی کے اِس طرح رونے سے اُس نے شرمندہ ہو کر کہا ——— "ماں جی آپ رو کیوں رہی ہیں؟ میں نے آپ کو دُکھی کرنے کی غرض سے تو ایسا نہیں کہا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ برابر ٹوکتے ہیں اِس لئے میں کہہ رہی تھی کہ اُبھی سے ہی روک تھام کرنے کی ضرورت ہے نہیں تو لڑکے کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ آپ میری باتوں کا کچھ خیال نہ کریں۔"

نارائینی نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا ——— "سب آدمیوں کو بھگوان ایک جیسا نہیں بناتا۔ رام تھوڑا شرارتی ہے۔ اِسی لئے سب کی باتیں چُپ چاپ سُن لیتی ہوں۔ لیکن لوگ تو دُوسروں کی بُرائی ہی دیکھنا جانتے ہیں۔ آخر یہ دُنیا والے چاہتے کیا ہیں؟ میں اُس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر ندی میں بہادوں؟ پھر شاید اُن لوگوں کو صبر آجائے"۔ اِتنا کہہ کر نارائینی بغیر کِسی جواب کا انتظار کئے ہی کمرہ میں چلی گئی۔

دِل ہی دِل میں سوچتی ہوئی برت کالی خود سے کہنے لگی ——— "میں نہیں جانتی تھی کہ ذراسی بات کہنے پر ماں جی بات کو اِتنا طول دینگی۔ بڑے ہی تعجب کی بات ہے کہ اتنی سمجھدار اور تجربہ کار ہو کر ماں جی اِتنی سی بات کو بھی نہیں سمجھیں۔ رہی سزا کی بات تو وُہ میں بھی دیکھ رہی

ہُوں۔ لڑکا ایک منٹ ایک پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ ماں جی نے سارا گھر سر پہ اُٹھا لیا۔ اُسی جگہ کھڑی بڑت کالی اور نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی اور کہتی رہی۔

دِن بیت گیا اور شہنشاہِ فلک آفتاب جہاں کو منوّر کرنے کی ذمہ داری ٹمٹماتے دیپک کو سونپ کر خود اپنی دُنیا میں چلا گیا۔

صُبح رام تو کھانا کھا کر جلدی چلا جاتا تھا سکول کو اور شیام لال اکے جانکیے کافی دیر بعد کچہری سے واپس آتے تھے۔ اِسی لئے کھانا کھانے میں اُنہیں کافی دیر ہو جاتی تھی۔ اِس طرح فقط رات کو ہی دونوں بھائیوں کو ساتھ ساتھ کھانے کا موقعہ ملتا تھا۔ لیکن رام اپنے بھیّا کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا ذرا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ وُہ نارائینی کے ہی ساتھ کھاتا تھا۔ آج دیدہ دانستہ اُس نے دونوں بھائیوں کا کھانا ایک ساتھ ہی پُروس دیا۔ گھر میں گھُستے ہی رام کی نظر اِس پر پڑی اور وُہ بھڑک اُٹھا۔ "جاؤ میں کھانا نہیں کھاؤں گا ہرگز ہرگز نہیں کھاؤں گا۔

نارائینی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ——— "تب جا کر سورہ ———"

اپنی بھابھی کا کورا جواب سُن کر وُہ حیران و ششدر رہ گیا۔ فوراً ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن وُہ کھانے نہیں بیٹھا صرف چُپ چاپ کھڑا رہا۔

رسوئی گھر میں شیام لال کو آتے دیکھ کر وُہ دُوسرے دروازے سے ہوا کے مانند باہر نکل گیا۔ وُہ اُپنے بھیّا کا سامنا بہت کم کرتا تھا، اور اکثر وہاں سے ہٹ جاتا تھا۔ شیام لال اپنی تھالی پر بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ کھاتے ہُوئے بولے ——— رام نے کھانا کھا لیا ہے کیا؟"

نارائینی نے کہا ——— "وہ آج میرے ساتھ کھائے گا۔"

شیام کے کھانا کھا کر چلے جانے کے بعد رام ایک مُٹھی راکھ لے کر باورچی خانہ کے اندر آیا اور کہنے لگا ——— "میں کسی کو بھی نہیں کھانے دُوں گا۔ سب کے کھانے میں راکھ ڈال دُوں گا ———

نارائینی ـــــ "راکھ ڈال کر تو دیکھ میں تیری کیسی پوجا کرتی ہوں۔"

رام ـــــ "کیا پوجا کرے گی؟ تم نے خود ہی صبح مجھے پھسلا کر بھات کھلا دیا تھا اور اب اس وقت کہتی ہو کہ پوجا کروں گی۔"

نارائینی ـــــ "تو نے کھایا کیوں؟"

رام ـــــ "تم ہی نے کہا تھا کہ رات کو ـــــ"

نارائینی ـــــ (قطع کلام کرتے ہوئے) "اتنا بڑا ہو گیا دوسرے کے ہاتھوں کھاتے شرم نہیں آتی؟"

رام نارائینی کی باتوں کو سن کر حیران رہ گیا اور بولا ـــــ "دوسرا کون؟ تمہیں نے تو صبح کھلانے کو کہا تھا۔ کیا تمہیں یاد نہیں ہے؟"

نارائینی نے کوئی بحث نہ کرتے ہوئے کہا ـــــ "اچھا جا راکھ پھینک دے اور ہاتھ دھو کر آ۔ اتنا کہے دیتی ہوں کہ پھر کبھی کھلانے کو نہ کہنا۔"

جس وقت نارائینی رام کو کھانا کھلا رہی تھی بغیر کسی مطلب کے ہی بنیا باورچی خانے کے دروازے سے ہوتی ہوئی اندر کا سب حال دیکھتی ہوئی باہر برآمدے میں نکل گئی۔

نارائینی نے بھی اس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ لیکن کچھ خیال نہ کیا۔ اس نے رام کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ بڑے پیار سے کہا ـــــ "لوگوں کی باتیں سنتے سنتے تو میں تنگ آ گئی ہوں میرے کان پک گئے ہیں رام۔ کیا تو کبھی بھی اچھا لڑکا نہ بنے گا؟ اب تو لوگوں کی باتیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔"

رام نے منہ کا نوالہ نگل کر کہا ـــــ "کون کہتا ہے؟ جو میرے پیچھے بے کار پڑے ہیں اُن لوگوں کا نام تو ذرا بتاؤ۔"

نارائینی نے بڑے غصّہ سے کہا ـــــ "ہاں میں تجھے اُن لوگوں کا نام بتا دوں تاکہ پھر تو شرارت کر سکے۔ میں صرف یہی چاہتی ہوں کہ تو اپنی شرارتوں سے باز آ جائے۔"

رام کو بھابھی کے لہجے میں کچھ دُکھ اور غم محسوس ہوا۔ اُس نے نارائینی کو دلاسہ دیتے ہُوئے کہا ــــــ "بھابھی تم ذرا بھی فکر نہ کرو۔ تم جو بھی کرنے کو کہو گی میں وہی کروں گا۔"

نارائینی کی ماں کا نام دِگمبری تھا۔ اُس کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اُس کی ایک لڑکی اور تھی جس کا نام سرُدھنی تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد سُسرال میں کسی کے نہ رہنے پر دِگمبری اپنے بھائی کے یہاں چلی آئی اور اپنے بھائی کی گرہستی کو سنبھالا۔ اُس کے بھائی کی بیوی کو مرے کئی سال ہو چکے تھے اور گھر میں اِس طرح کسی کے نہ رہنے پر اُنھوں نے اسے اپنے پاس بُلا لیا۔ اِس طرح اپنے بھائی کے مکان میں اپنی دس سالہ لڑکی سرُدھنی کو لے کر دِگمبری اپنے دِن کاٹ رہی تھی۔ لیکن قُدرت کو یہ بھی منظور نہ تھا۔ دِگمبری بھائی کے پاس بھی زیادہ دن نہ رہ سکی۔ کیونکہ اُس کے بھائی کو بھی پیغامِ اجل آگیا۔ تب تو اُس کے لئے اپنی بیٹی نارائینی کو چھوڑ کر اور کوئی اپنا سہارا دینے والا نہ تھا۔ اِس لئے اور کوئی ذریعہ نہ دیکھ کر اپنے دُکھ کی خبر اُس نے نارائینی تک پہنچائی۔

نارائینی نے رات کے کھانے کے وقت شیام لال سے اپنی ماں پر آئی ہُوئی مُصیبت کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ اب اُس کو چھوڑ اور کوئی دُوسرا اُس کا سمبندھی بھی نہیں بچا ہے۔ جس سے وہ اِس مُصیبت کے وقت سہارے کی اُمید کر سکے۔ علاوہ ازیں ماں کے آجانے سے گرہستی کے کام کاج میں بہُت کچھ مدد بھی مل سکے گی۔ شیام لال نارائینی کی باتوں سے متفق ہو گیا اور کہنے لگا کہ کل سویرے کسی کو بھیج کر اُنہیں بُلوا لیا جائے گا۔"

دُوسرے دِن دوپہر تک دِگمبری اپنی لڑکی سرُدھنی کو لے کر نارائینی کے گھر آ پہنچی آتے

ہی اُس کی نظر رام پر پڑی۔ جانے کیسے عجیب طریقہ سے مُنہ بنا کر اُس رام کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہُوا جیسے کہ وُہ رام کو پھُوٹی آنکھوں سے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تُھیں کے اِن جذبات کو دو تین دِن ہی میں گھر کے دیگر سب لوگ بھی سمجھ گئے۔

کئی روز بعد کی بات ہے کہ رام ایک پیپل کے درخت کی ٹہنی لے کر گھر میں آیا۔ آنگن میں ایک گڑھا کھود کر اُس نے بڑی کاوشوں سے اُس ٹہنی کو لگایا۔ دِگمبری رسوئی گھر کے دروازہ میں بیٹھی رام نام کی مالا جپ رہی تھیں۔ مالا گُھماتے گُھماتے وُہ رام کے کرتُوت بھی دیکھے جا رہی تھی۔ لیکن چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اُسے رام کے یہ لچھن ذرا بھی پسند نہیں آ رہے تھے۔ آخرکار جب اُس سے نہ رہا گیا تو بڑے تیکھے لہجے میں کڑکی ــــــ "اُس درخت کا کیا ہوگا رام؟"

رام بولا ــــــ "یہ پیپل کی ٹہنی کچھ دِن بعد بڑھ کر ایک بہت بڑا درخت بن جائے گی۔ اور پھر وُہ درخت آنگن میں چھایا کرے گا۔ ہمارے ماسٹر جی نے بتایا ہے کہ پیپل کے درخت کی چھاؤں بڑی ٹھنڈی ہوتی ہے۔"

پھر وہ گوبند اور بھولا سے مخاطب ہُوا ــــــ "گوبند! تو جا پانی لے آ۔ اِس درخت کو پانی دے کر سینچوں گا۔ اور بھولا! تو جا چھوٹے چھوٹے دیکھ کر بانس توڑ لے آ۔ اُسے کاٹ کر اِس کے چاروں طرف باڑ لگاؤں گا نہیں تو اپنی گائے اور بچھڑا ہی اِسے کھا جائیں گے۔"

رام کی باتیں سُن کر دِگمبری سر سے لے کر پاؤں تک جل بھُن گئی۔ چڑ کر بولی ــــ "یہ آنگن میں پیپل کا درخت۔ ہے بھگوان۔ ایسی انوکھی بات تو میں نے آج تک نہ سُنی نہ دیکھی۔

رام نے اُس کی بات سُنی تک نہیں۔ اِسی دوران اپنے اوقات کے مطابق گوبند چھوٹے سے لوٹے میں پانی بھر کر لے آیا۔ اُس کے ہاتھ سے لوٹا لے کر رام بڑے پیار سے

بولا ـــــ "ارے پگلے! تیرے ذرا سے پانی سے کیا بنے گا۔ اچھا تو یہاں کھڑا رہ۔ میں خود پانی لے کر آتا ہوں۔"

اِس طرح گوبند کو کھڑا کر کے وُہ خود پانی لینے چل دیا۔ چھوٹی بالٹی میں کئی دفعہ پانی لا کر اُس نے اُس درخت کو بالکل تر کر دیا۔ ضرورت سے زیادہ پانی چھوڑ دینے سے سارے آنگن میں کیچڑ ہو گیا۔

نارائینی کے ندی سے نہا کر آنے سے پہلے ہی درخت لگانے اور اُسے سینچنے کا کام ختم ہو چکا تھا۔ صرف اُس کے چاروں طرف باڑھ لگانا باقی تھی۔ اور بھولا ابھی تک بانس لے کر آیا نہیں تھا۔

دِگمبری اب آگ ویسے ہی جل رہی تھی۔ اُس کے سامنے ہی اتنا بڑا ڈرامہ شروع بھی ہُوا اور ختم بھی ہو گیا۔ وُہ بھی اُس کی مرضی کے خلاف اور وُہ کچھ بھی کر نہ سکی۔ اُسے وُہ کیونکر برداشت کر سکتی تھی۔ اُسی وقت نارائینی بھیگے کپڑے پہنے اور کمر پر بھاری گھڑا رکھے مکان میں داخل ہُوئی۔ ٹھیک وقت پر نارائینی کو آتی دیکھ کر دِگمبری چلائی ـــــ "دیکھ نارائینی آنکھ کھول کر اپنے لاڈلے دیور کے کرتوت دیکھ۔ ٹھیک آنگن کے بیچ پیپل کا درخت لگا کر کہتا ہے کہ ٹھنڈی چھایا ہو گی اور اُس طرف دیکھ بدمعاش بھولا کے کرتوت کتنا بڑا بانس کا جھاڑ لے کر آ رہا ہے۔ اِس پیپل کے چاروں طرف حفاظتی باڑھ لگائی جائے گی۔"

نارائینی نے دیکھا۔ سچ مچ بھولا بانس کا ایک بڑا سا جھاڑ کھینچتا ہُوا چلا آ رہا تھا۔ بھولا کی عمر بھی رام کی عمر کے لگ بھگ ہی ہو گی۔ لیکن وُہ بہت سیدھا تھا۔ پورا بھولا ہی تھا۔ اِس تمام کھیل کو دیکھ کر نارائینی کی ہنسی روکے نہ رُکی۔ ایک طرف ماں کا ناجائز غصہ اور دوسری طرف رام کا پاگل پن دونوں ہی اُس کی ہنسی کے سبب تھے۔ ہنستے ہوئے وُہ رام سے بولی ـــــ "اِس بیچ آنگن میں پیپل کا درخت کیا ہو گا رے پاگل؟"

رام نے جیسے بھابھی کے ناسمجھی پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "ارے بھابھی تم کیا۔ اتنا بھی نہیں جانتیں۔ یہ چھوٹا سا پیپل کا درخت بڑا ہو کر بڑا گھنا ہو جائیگا اور کیا ہی ٹھنڈی اور پیاری چھایا ہو گی اس کی؟ پھر یہ چھوٹی سی ڈال دیکھ رہی ہو نا۔ ۔۔۔ اسی دوران گوبند کو اس ڈال کی طرف انگلی رکھاتا ہوا دیکھ کر اس نے منع کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "ارے گوبند انگلی نہیں دکھاتے اسے" ۔۔۔ (نارائینی سے) ۔۔۔ "تو بھابھی اس ڈال پر جب یہ موٹی اور بڑی ہو جائے گی گوبند کے جھولنے کے لئے جھولا ڈالوں گا"۔ بھولا اب تک رام کے نزدیک آ پہنچا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رام بولا ۔۔۔ "او بھولا ذرا اونچا پیڑ اپنا نا ہو گا نہیں تو کہیں ایسا نہ ہو اپنی کالی گائے گردن بڑھا کر درخت کو صفاچٹ کر جائے۔ اچھا لا مجھے کلہاڑی دے دے میں خود کاٹوں گا۔ یہ کام ذرا مشکل ہے تجھ سے نہ ہو گا۔ اسی طرح رام نے بھولا سے کلہاڑی لے کر کھٹ کھٹ ٹھک ٹھک بانس کاٹنا شروع کر دیا۔

نارائینی ان کا یہ پاگل پن دیکھ کر ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن گئی لیکن کچھ نہ کہہ کر مسکراتی ہوئی کمر کے بڑے گھڑے کو رسوئی گھر میں رکھنے چلی گئی۔

دگمبری نے دیکھا کہ نارائینی نے رام سے کچھ کہا تک نہیں صرف ہنس کر ٹال گئی ہے۔ اب تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ مارے غصّہ کے اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں اور اس نے اسے اپنی توہین سمجھا ۔۔۔ اس سے کچھ کہا تک نہیں ۔۔۔ صرف ہنس کر ہی ٹال دیا ۔۔۔ تب کیا یہاں پر پیپل کا درخت لگ کر ہی رہے گا؟

نارائینی ۔۔۔ "ماں! آپ اتنا پریشان کیوں ہوتی ہیں؟ اتنا بڑا درخت اسی پاگل پنے سے ہوتا ہے۔ ارے اس ٹہنی میں کیا جڑ مول ہے جو گھڑا گھڑا پانی ڈالنے سے بڑھ کر اونچا چھایہ دار درخت بن جائے گا۔ آپ دیکھتی تو رہیے۔ وہ ٹہنی تو کل ہی سوکھ کر گر پڑے گی۔"

لیکن دِگمبری کو اِن باتوں سے تسلّی نہ ہوئی۔ وُہ جیسے رآم کی ذرا سی بات بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ کہنے لگی ——— "نارآیئنی اگر بھلا چاہتی ہے تو اِسی وقت اِسے اُکھاڑ کر پھینک دے۔ اور۔ وُہ سُوکھے گا کیا؟"

نارآیئنی نے اُس کی باتیں سُن کر بڑی بے چین ہو کر کہا ——— "ایسا کرنے سے تو ابھی غضب ہو جائے گا۔"

دِگمبری ——— "اِس مکان پر اکیلے اُسی کا حق ہے؟ جو وُہ چاہے گا کرے گا یہاں تک کہ بیچ آنگن میں بغیر کسی سے پُوچھے ہی پیپل کا درخت لگائے گا۔ کیا تم لوگوں کی نگاہ میں اُس نے کچھ نہیں کیا۔ میرے گوبند کا بھی یہاں کچھ حق نہیں ہے۔ پھر پیپل کے درخت پر باز۔ کوّا۔ چیل وغیرہ آکر تمام آنگن میں گندگی پھیلائیں گے۔ ایسا ہونے پر تو نارآیئنی میں یہاں ایک پَل بھی نہ رہ سکوں گی۔ آخر تم کس وجہ سے اُس سے خوف کھاتی ہو۔ اگر یہ گھر میرا ہوتا تو دیکھتی کہ وُہ کتنا بڑا شیطان ہے۔ ایک ہی دِن میں اُسے سیدھا کرکے رکھ دیتی۔ تُو ہی اُس کی سبھی باتیں برداشت کر لیتی ہے۔ اِسی وجہ سے وُہ سر پر چڑھا ہُوا ہے۔ میرے اِختیار میں ہو تو ———"

نارآیئنی اِس سے زیادہ برداشت نہ کر سکی۔ رآم کے خِلاف اِتنا ہی بولنا گالی دینے پر ہی نارآیئنی اپنی ماں کی گندی اور ناپاک رُوح کو سمجھ چُکی تھی۔ اُس دِن بِرت کالی کے ذرا سا کہنے پر ہی نارآیئنی کی آنکھوں سے گنگا جمنا کی دھاریں بہہ نکلی تھیں لیکن دِگمبری اُس کی ماں تھی۔ اُس کے تئیں کچھ اُبھی کہنے کا اس کا منہ نہ کُھلا۔ کچھ دیر چُپ رہ کر اپنے چہرے پر زبردستی مُسکراہٹ لاتے ہُوئے بولی ——— "ماں وُہ تو بچہ ہے اور پھر اُسے ابھی اِتنی عقل ہی کہاں ہے۔ عقل ہونے سے کیا کوئی اپنے آنگن میں پیپل کا درخت لگاتا ہے؟ آپ دو دِن ٹھہر کر دیکھئے تو وُہ خود ہی اُسے پھینک دے گا۔"

دِگمبری ــــــ "ارے وُہ کیا پھینک دے گا۔ میں ہی نہ اُس ٹہنی کو درخت بننے سے پہلے ہی توڑ کر پھینک دُوں گی۔"

نارائینی ــــــ "نہیں ماں نہیں۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہُوں کہ آپ ایسا نہ کریئے گا۔ آپ اُسے نہیں جانتیں۔ مجھے چھوڑ کر اُس کو چھُونے کی ہمّت اُس کے بھیّا بھی نہ کرینگے۔ کم سے کم آج کا دن تو گذر جانے دیجئے۔"

رام کی باتوں کے آگے دِگمبری کی بات نہ رکھی جائے یہ وُہ کیسے برداشت کر سکتی تھی؟ رام کو دیکھتے ہی جیسے اُس کا خُون کھول اُٹھتا تھا۔ اُس نے بڑی بے چینی کا اظہار کرتے ہُوئے کہا ــــ "جا پہلے تُو کپڑے تو بدل لے۔"

اُس وقت دِگمبری اپنی توہین کو پی سی گئی۔ لیکن جو آگ اُس کے دِل میں سُلگ چکی تھی وُہ آسانی سے ٹھنڈی ہونے والی نہ تھی۔

دوپہر کو نارائینی گھر کے دیگر کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے کمرہ میں بیٹھی تکیہ کے غلاف سی رہی تھی۔ اُسی دوران نرتّ کالی نے آکر اُسے خبر دی کہ بڑی ماں جی نے چھوٹے بابُو کا درخت اُکھاڑ کر پھینک دیا ہے اور وُہ سکوُل سے آکر اپنا درخت نہ دیکھے گا تو بہت بڑا ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہو گا۔" نارائینی نے نرتّ کالی کی اِتنی سی بات سُن کر فوراً باہر آکر دیکھا۔ سچ مچ رام کا درخت آنگن میں نہیں تھا۔

اُس نے اپنی ماں کو وہاں دیکھ کر پُوچھا ــــــ "ماں رام کا درخت کیا ہُوا ــــــ؟"

دِگمبری نے عجیب سا مُنہ بنا کر ایک طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا ــــ "وُہ دیکھ۔ نارائینی نے نزدیک جا کر دیکھا۔ وُہ درخت صرف اُکھاڑا ہی نہیں گیا تھا بلکہ بُری طرح توڑ مروڑ کر پھینک دیا گیا۔ ایک پتّہ بھی اُس ٹہنی کا ثابت نہ بچا تھا نارائینی کو اپنی ماں کا سیاہ دِل صاف دِکھائی دے گیا۔ لیکن خموش رہی اور چُپ

چاپ اُس درخت کو اُٹھا کر باہر پھینک آئی۔ تاکہ رام اُسے نہ دیکھ سکے۔ وہ چُپ چاپ آکر اپنے کام میں پھر سے مصروف ہو گئی۔

سکول سے آکر رام نے سب سے پہلے اپنی نظر اپنے درخت پر ڈالی اُسے وہاں نہ دیکھ کر رونا پیٹنا اور چلّانا شروع کر دیا۔ اپنی کتاب وغیرہ آنگن میں پھینک کر وہیں سے چلّا کر اپنی بھابھی کو آوازیں لگانے لگا ——— "بھابھی او بھابھی۔ میرا درخت کہاں ہے؟"

نارائینی نے فوراً رسوئی گھر سے نکل کر کہا ——— "بتاتی ہوں۔ پہلے اِدھر تو آ ———"

رام ——— "میں نہیں آتا۔ میرا درخت کہاں ہے؟"

نارائینی ——— "میں کہتی ہوں اِدھر آنا؟ بتاتی ہوں"۔

رام کے قریب آتے ہی وہ اُس کا بازو تھام کر رسوئی گھر میں لے گئی اور اپنی گود میں بٹھا کر اُس کے سر پر پیار کے ساتھ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی ——— "ارے پاگل منگلوار کو کیا کوئی اپنے آنگن میں بیل کا درخت لگاتا ہے؟"

رام نے اُس کی بات بڑی دلچسپی سے سُنتے ہوئے کہا ——— "کیوں منگل کو، درخت لگانے سے کیا ہوتا ہے؟"

نارائینی نے ہنستے ہوئے کہا ——— "اُس سے گھر کی بڑی بہو مر جاتی ہے"۔

رام یہ سُن کر سناٹے میں آگیا۔ لیکن اُسے یقین نہ ہوا کہنے لگا ——— "جاؤ بھابھی جھوٹ بات ہے"۔

نارائینی ——— "نہیں رے جھوٹی بات نہیں ہے۔ اگر تجھے یقین نہ ہو تو پترا دیکھ لے"۔

رام ——— "لاؤ دکھاؤ پترا"۔

اچانک پتراد کھانے کی بات سُن کر وُہ گھبرا گئی۔ لیکن خُود کو سنبھال کر بولی ــــــ "تجھے پترا دیکھنا آتا بھی ہے؟ جو تُو پترا دیکھے گا۔ پھر کون بُدھ منگل کو پترا دیکھتا ہے؟ اِس کے علاوہ کہیں اِتنی معمُولی سی بات پر کوئی پترا دیکھتا بھی ہے؟ یہ تو بھولا کو بھی معلوم ہو گا۔ جا تُو ابھی اُسے بُلا کر لا۔ میں ابھی پُوچھ دیتی ہُوں"۔

اِتنی بڑی بات معلُوم نہ ہونے کی وجہ سے اُس نے اپنی بڑی بے عزّتی محسُوس کی۔ ماں کے مانند بھابھی کے گلے میں اپنی دونوں باہیں ڈال کر کہنے لگا ــــــ "ارے یہ تو مَیں بھی جانتا ہُوں۔ اَچھا اُسے پھینک دینے میں تو کوئی حرج نہیں ہے نا؟"

اِس کے جواب میں نارایئنی نے بڑے پیار سے سر ہلا کر کہا۔ اُس کی دونوں آنکھیں جذبات کی شدّت سے بھر آئیں۔ کہنے لگی ــــــ "اچھا رام اگر مَیں مر جاؤں تو تُو کیا کرے گا ــــــ؟"

رام نے فوراً بھابھی کے مُنہ پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا ــــــ "نا بھابھی ایسا نہیں کہتے ــــــ"

نارایئنی نے اُس سے چُھپا کر اپنی آنکھیں پُونچھتے ہُوئے کہا ــــــ "ارے بڑھیا ہو گئی ہُوں کیا اب نہیں مروں گی۔؟"

رام نے جیسے اِس دفعہ نارایئنی کی ہنسی کی بات سمجھ لی۔ کہنے لگا ــــــ "بھابھی تُم بُڑھیا ہو؟ نہ تو تمہارا کوئی دانت ٹُوٹا ہے۔ اور نہ کوئی بال ہی سُفید ہُوا ہے؟"

نارایئنی ــــــ "بال نہ سُفید ہُوئے سہی۔ لیکن میں تو جا کر ایک دِن ندی میں ڈوب مروں گی یا پھر کہیں چلی جاؤں گی؟"

رام ــــــ "کیوں بھابھی؟"

نارایئنی ــــــ "تیرے ہی مارے تو۔ میری ماں سے دِن رات جھگڑا رہتا ہے ایک دِن بھی پھُوٹی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ کسی دِن جب میں چُپ چاپ چلی جاؤں گی

اور پھر لوٹ کر نہ آؤنگی تب پتہ چلے گا تمہیں۔"

اِس پر رام کو یقین تو نہ ہُوا۔ لیکن پھر دِل ہی دِل میں کچھ گھبرا کر کہا ——— "اچھا بھابھی۔ میں اُن سے کچھ بھی نہ کہُوں گا۔ لیکن وُہ کیوں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہیں؟"

نارائینی ——— "اُنہیں کہنے دیا کر۔ وُہ میری ماں ہیں۔ اور تیری بھی تو بڑی ہیں۔ جس طرح تو مجھ سے پیار کرتا ہے اُسی طرح اُن سے پیار کیا کر۔"

رام نے یہ سُن کر اپنی بھابھی کے آنچل میں اپنا مُنہ چھپالیا۔ اِسی محبت بھرے آنچل کی اوٹ میں اُس نے اپنے بچپن کے بارہ سال ہنستے کھیلتے گذارے تھے۔ اب اِتنی بڑی غلط بات۔ جیسے اُس کا دِل کبھی برداشت نہیں کر سکتا کیسے اپنی زبان پر لا سکتا تھا یہ بالکل ناممکن تھا۔ اِسی لئے اُس نے اپنا مُنہ اُسی آنچل میں چھپالیا۔ اور نارائینی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

نارائینی رُندھے گلے سے بولی ——— "مُنہ چھپانے سے کیا ہوگا رے؟"

ٹھیک اُسی وقت دِگمبری جو ہمیشہ ایسے موقعوں کی تلاش میں گھومتی رہتی تھی رسوئی گھر کے دروازے پر آئی اور مخصُوص لہجے میں کہنے لگی ——— "کُچھ کام کاج تو ہے نہیں نارائینی دیور کو لے کر اِسی سے سہاگ منایا جارہا ہے نا؟ ذرا اپنے لڑکے کو بھی تو دیکھ بیچارہ سُوکھ کر کانٹا ہوتا جارہا ہے۔ اِس کا بھی کُچھ خیال ہے؟"

رام نے اُس کی آواز سُن کر مُنہ اُٹھا کر دیکھا۔ دِگمبری کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھُوٹنے لگیں۔ وُہ کُچھ کہنے ہی جارہا تھا کہ نارائینی نے زور سے اُس کا مُنہ اپنی چھاتی سے دَبالیا۔ ماں سے بولی ——— "آخر میرا لڑکا کس بات سے سُوکھ کر کانٹا ہوتا جارہا ہے ماں؟"

دِگمبری سے کوئی بات نہ بنی۔ لیکن صرف اتنا کہہ کر " میں کیا جانُوں؟" اُلٹے پاؤں جیسے آئی تھی ویسے ہی لوٹ گئی۔

رام سے نہ رہا گیا۔ اُس نے زبردستی اپنا سر اُٹھاتے ہُوئے کہا —— "میں اِس چُڑیل بُڑھیا کا سر توڑ دُوں گا۔ گردن دبا کر مار ڈالوں گا۔"

نارائینی اُس کا مُنہ بند کرتے ہُوئے بولی —— "چُپ رہ پاجی۔ وُہ ماں ہے نا؟"

جب سے دِگمبری آئی تھی وُہ کسی نہ کسی بہانہ سے رام سے اُلجھ پڑتی تھی۔ رام تو نادان تھا ہی۔ لیکن دِگمبری اِتنی بڑی بُوڑھی ہو کر بھی اپنے گندے اور بُرے مزاج کی وجہ سے آئے دن کوئی نہ کوئی بکھیڑا کھڑا کئے ہی رکھتی تھی۔

تین چار دِن کی بات ہے رام کھانا کھا رہا تھا۔ اُس نے ایک دو نوالے ہی کھائے تھے کہ کھوں کھوں کر کے کھانسنے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ وُہ گلاس بھر پانی ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ اور کھڑا ہو کر پاؤں پٹکتے پٹکتے ہُوئے چِلّانے لگا —— "اِس ڈائن بُڑھیا کے ہاتھ کا کھانا۔ میں کبھی نہیں کھاؤں گا۔ ہرگز نہ کھاؤں گا۔ ارے بھابھی او بھابھی مارے مرچوں کے میرا مُنہ جل گیا ہے ——"

اُس کی آواز سُن کر نارائینی سندھیا کی پُوجا چھوڑ کر دوڑی آئی اور رام سے پُوچھا —— "کیا ہُوا رے؟"

رام مارے غصّہ کے روتے ہُوئے بولا —— "اِس کے ہاتھ کا کھانا میں کبھی نہ کھاؤں گا بھابھی۔ اِس چُڑیل کو نِکال باہر کرو یہاں سے"۔ اتنا کہہ کر رام تیزی سے مکان سے باہر نِکل گیا۔

نارائینی کچھ دیر تو چُپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر ماں سے مخاطب ہُوئی —— "ماں

کتنی بار کہا ہے کہ ساگ میں اتنی مرچ مت ڈالا کرو۔ اِس گھر میں اتنی مرچ کوئی نہیں کھاتا۔"

دِگمبری بھی غصّہ سے لال ہو کر بولی ——— "کہاں اتنی مرچ ڈالی ہے۔ دو ہی تو مرچیں ڈالی ہیں۔ اِسی میں اتنا ہنگامہ ہو گیا۔ سارا گھر سر پہ اُٹھا لیا۔"

نارائینی ——— "جب کوئی یہاں مرچ کھاتا ہی نہیں تو پھر دو مرچیں بھی ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟ تب ———"

دِگمبری ——— "چُپ رہ نارائینی چُپ رہ۔ تُو اب مجھے ہی رسوئی بنانا سکھائیگی رسوئی ہی تو بناتے بناتے میرے بال پک گئے۔ اور اب اپنے ہی پیٹ کی لڑکی سے رسوئی بنانا سیکھنی ہو گی۔ لعنت ہے مجھ پر ———"

دِگمبری کی باتوں کا کچھ بھی جواب نہ دے کر نارائینی رسوئی گھر میں جا کر نئے سرے سے رسوئی کرنے کا بندوبست کرنے لگی۔

اِدھر دِگمبری دونوں پاؤں زمین پھیلا کر دونوں ہاتھوں سے سر اور سینہ پیٹتی ہوئی زور زور سے چلّا کر رونے لگی۔۔۔ "ارے او بھیّا۔ تم کہاں ہو؟ ایک بار مجھے بھی اپنے پاس بُلا لو نا؟ جس کے دِل میں جو آتا ہے مجھے گالیاں دیتا ہے۔ ارے بُڑھیا میں چڑیل ہوں کل کا چھوکرا مجھے نکال باہر کرنے کو کہتا ہے۔ میں کتنی نیچ ہوں کہ بیٹی اور داماد کا نمک کھا رہی ہوں۔ مرنے کے لئے میرے گلے کو رسّی بھی نہیں ملتی۔ اِس بے عزّتی سے تو اچھا ہے کہ مانگ کر ہی گزارہ کر لوں۔ سرو۔ او سرو۔ چل بیٹی اس گھر سے۔ میں تو اب یہاں کا پانی بھی پینا حرام سمجھتی ہوں۔ آ بیٹی چل۔"

روتی ہوئی ماں کے پاس سر دُھنتی آ کر کھڑی ہو گئی۔ دِگمبری اُس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کو تیار ہوئی کہ اُسی وقت نارائینی رسوئی گھر سے نکل کر آئی اور ماں کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

اُسے دیکھ دِگمبری روتے روتے بولی ——— "مجھے مت روک نارائینی جانے

دے۔ ہم لوگ بغیر کھائے پیئے درخت کے سایہ تلے رہ کر مر جائینگے۔ لیکن تیرے گھر کا پانی بھی نہ چھوئیں گے۔ اور نہ تیرے گھر میں رہیں گے۔"

ناراینی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بڑی حلیمی سے کہا ——— "ماں آپ کس پر اتنا غصہ کر کے جا رہی ہیں؟ کیا ہم لوگوں سے کوئی خطا ہوئی ہے؟"

دِگمبری کا رونا پنچم سُر کو جا پہنچا۔ روتے ہوئے بولی ——— "میں ناداں بچی نہیں ہوں ناراینی۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ اُسے تیرا ہی اشارہ تو ملتا ہے۔ نہیں تو کیا اُس کی یہ ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ میری توہین کرے۔ میں چڑیل ہوں۔ مجھے نکال باہر کر دو اچھی بات ہے میں تو جا رہی ہوں۔ ہم لوگ تو تمہارے گلے کا پھندا تھے نا؟ راستہ چھوڑ دے ناراینی جانے دے ہمیں ———"

ناراینی اپنی ماں کے دونوں پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی اور بولی ——— "ماں اب جو کچھ ہوا اس کے لئے میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ رام کے بھیا کو آ جانے دو۔ اس کے بعد جہاں تمہاری مرضی ہو چلی جانا۔ اِس وقت تو گھر میں چلو ماں۔ اتنا کہہ کر ناراینی اپنی ماں کے دونوں ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے کمرے میں لے آئی۔ اور اُنہیں چٹائی پر بٹھا کر سرہانے کھڑے ہو کر پنکھے سے ہوا دینے لگی۔

اِس وقت تو دِگمبری کے غصّہ کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ لیکن دوپہر کو رسوئی گھر میں شیام لال کے کھانے کو آنے وقت اُس کا ناٹک پھر سے شروع ہو گیا۔ شیام لال کو پروسی تھالی پر بیٹھتے ہی دِگمبری نے کواڑ کے پیچھے چھپ کر پھر رونا شروع کر دیا۔ اور خوب نمک مرچ لگا کر صبح کی باتیں بنانے لگی۔ پہلے تو اچانک رونے کی آواز سُن کر شیام لال ہکا بکا ہو کر تاکتے رہے۔ لیکن اُنہیں سمجھتے دیر نہ لگی کہ اِس ڈرامہ کا ہیرو رام کے سوائے اور کوئی اور نہیں۔ اب تک اُنھوں نے ایک دو نوالے ہی کھائے تھے لیکن سبھی باتیں معلوم ہو جانے پر وہ باقی تمام کھانا تھالی ہی میں چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

نارائینی کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ یہ غصّہ کس پر ہے۔ لیکن نرت کالی سے شیام لال کا اِس طرح نہ کھا کر اُٹھ جانا برداشت نہ ہُوا۔ دُہی اِس گھر میں کھری بات کہنے والی تھی جیسے جو کچھ کہنا ہوتا بغیر جھجک کے وُہ اُس کے مُنہ پر کہہ ڈالتی تھی۔ وُہ دِگمبری سے بول ہی تو اُٹھی ـــــــ "بڑی ماں جی آپ نے جان بوُجھ کر بڑے بابو کو کھانا بھی نہیں کھانے دیا۔ صُبح کے گئے بے چارے کام کاج سے تھکے ماندے آئے تھے آپ کو اُن پر کیا ذرا بھی ترس نہ آیا؟ تھوڑی دیر ٹھہر کر رو لیتیں۔ آپ کی آنکھوں کی ندی سُوکھی تو نہیں جا رہی تھی۔ کم سے کم بابو کو کھانا تو کھا لینے دیتیں۔ دو منٹ ٹھہر جانے سے کچھ حرج نہ ہو جاتا۔

دِگمبری کالا مُنہ کئے چُپ چاپ اپنی کرنی کا تماشہ دیکھتی رہی۔

دوپہر کو رام کہیں سے گھُومتا پھرتا گھر میں آیا۔ بھابھی کی تلاش میں وُہ اِس کمرہ سے اُس کمرہ ہیں اُن کے کمرہ میں آیا اور دیکھا کہ نارائینی کو بند کو لے سو رہی ہے اُسے آج میں کچھ کالا نظر آیا۔ اِس لئے بُہت آہستہ سے اُس نے نارائینی سے کہا۔

ـــــ "بھابھی بھُوک لگی ہے۔"

نارائینی نے کوئی جواب نہ دیا۔

اِس دفعہ ذرا زور سے رام نے کہا ـــــــ "بھُوک لگی ہے کیا کھاؤں بھابھی؟"

اِس دفعہ نارائینی نے جواب دیا لیکن سوئے ہی سوئے ـــــــ "میں کچھ نہیں جانتی تُو یہاں سے چلّا جا۔"

رام ـــــــ "معلُوم ہوتا ہے تجھے بھُوک نہیں لگتی۔"

نارائینی نے مُنہ پھیر کر بڑے کرب سے کہا ـــــــ "میرا سر مت کھا رام پنیتا وہیں کہیں ہوگی اُس سے جا کر مانگ لے۔"

رام نے کچھ بھی کہنا ٹھیک نہ سمجھا اور چُپ چاپ باہر چلے جانے میں ہی خیریت

محسُوس کی۔ پنیا اُسے اسوئی گھر کے دروازے پر ہی مل گئی۔ رام نے اُس سے کھانے کو مانگا۔ جیسے وُہ اُس کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ اُس نے فوراً ہی ایک کٹورے میں دُودھ۔ تھوا سا چبینا اور پانچ چھ ٹکڑے ناریل کی گری کے لاکر رام کے سامنے رکھ دیئے۔

رام نے تنک کر کہا ـــــ "کیا یہی کھانا ہے؟"

پنیا بولی ـــــ "چھوٹے بابو اگر خیریت چاہتے ہو تو کچھ گڑبڑ نہ کرو۔ کچھ معلُوم بھی ہے کہ آج بڑے بابو بغیر کھائے ہی کچہری چلے گئے ہیں۔ ماں جی بھی بھوکی پیاسی گوبند کو لے کر سوئی پڑی ہیں۔ اگر یہ گڑبڑ سُن کر اُٹھ آئی تو اس کا نتیجہ بہت برا ہوگا۔"

رام کو پہلے ہی شک تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اب تو پنیا کے منہ سے سنکر معاملے کی گہرائی اور بھی واضح ہوگئی۔ اس سے وُہ کچھ بھی نہ بولا۔ چُپ چاپ دُودھ کا کٹورا اُٹھا کر دُودھ پی کر چلا گیا اور چبینا اور گری کے ٹکڑے جیب میں ڈال تلاب کے درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ کھانے کو تو وُہ ایک ایک دانہ کرکے مُنہ میں ڈال رہا تھا۔ لیکن اُس کی بھوک اُسی وقت مر چکی تھی جب کہ اُسے یہ معلُوم ہُوا کہ بھابھی بغیر کچھ کھائے پیئے ہی سوئی ہُوئی ہے اس لئے اُس سے کچھ بھی کھایا پیا نہیں جا رہا تھا۔ وُہ طرح طرح کی باتیں سوچنے لگا۔ اُس کے خیال میں عجیب قسم کے خیالات گردش کرنے لگے۔ اُس کے دِل میں خیال آیا کہ اگر وُہ سادھو سنیاسیوں کے مانند منتر جانتا ہوتا۔ تو اِسی وقت منتر کے زور سے یہاں سے بیٹھے ہی بھابھی کا پیٹ بھر دیتا۔ پھر اِس سے بھی کیا ہوگا؟ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ بھیا نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے تب پھر بھابھی بھلا کیسے کھا سکتی ہے۔ اور ایسی حالت میں زبردستی کرنا بھی بالکل بے سُود ہوگا۔ اَب تو اُس سے ایک دانہ بھی نہیں کھایا جا رہا تھا۔ اُس نے اپنی جیب کا چبینا اور گری سب تالاب میں پھینک دیا۔ اور اپنی شوخ طبیعت کے ہاتھوں لاچار ہو کر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اُس کے دِل میں ایک ہی خیال بار بار اُٹھ کر اُسے بے چین

کر رہا تھا کہ آج بھابھی نے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ جتنی دفعہ وُہ اِسے سوچتا اتنا ہی زیادہ اُسے اپنے دِل میں درد اُٹھتا محسُوس ہوتا۔

رات کو شیام لال نے اپنی بیوی نارائینی سے کہا ——— "اب تو مجھ سے بالکل ہی برداشت نہیں ہوتا۔ اُسکے ساتھ اب اِس گھر میں اکھٹے رہنا ناممکن سا محسُوس ہو رہا ہے"

نارائینی نے حیران ہو کر پُوچھا ——— "آپ کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟"

شیام لال ——— "ارے وُہی رام کی بات کر رہا ہُوں۔ آج چار پانچ دِن سے تمھاری ماں جی مسلسل کہے جا رہی ہیں کہ رام اُن کی بے سبب ہر وقت توہین کرتا رہتا ہے۔ میں کل ہی گاؤں کے چودھریوں کو اکٹھا کر کے روپیہ پیسہ زمین جو کچھ بھی ہے سب برابر سے بانٹ کر اُس کا حصّہ اُسے دے کر الگ کر دُوں گا۔ اب تو مجھ سے یہ روز روز کی کِلکِل ذرا بھی برداشت نہیں ہوتی"

نارائینی کچھ دیر غم اور حیرت سے مُنہ لٹکائے بیٹھی رہی۔ پھر بولی ——— "کیا رام کو الگ کر دوگے؟ وُہ نادان لڑکا ہے۔ تمہاری دولت جائیداد لے کر وُہ بھلا کیا کرے گا؟"

شیام لال نے طنزیہ کہا ——— "ہاں ہاں وُہ تو ابھی بچّہ ہی ہے جائیداد لے کر وُہ کیا کرے گا۔ یہ میں کیا جانُوں؟ وہی جانے۔ مَیں کچھ نہیں جانتا۔ میں اُس کا حصّہ اُسے دے کر اُس سے نجات پاؤں گا"

نارائینی ——— "وُہ تو کچھ نہیں جانتا۔ لیکن میں تو جانتی ہُوں نا؟ معلُوم ہوتا ہے کہ ماں جی لگاتار چار پانچ دِن سے یہی باتیں کہے جا رہی ہیں۔ میں آپ سے زیادہ اپنی ماں کو اچھی طرح سمجھتی ہُوں"

شیام لال نے کچھ جھجکتے ہُوئے کہا ——— "نہیں نہیں اُنھوں نے اِس بات پر کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ مَیں نے خود بھی کچھ اپنی آنکھوں سے کیا نہیں دیکھا؟ آخر تمہارا خیال کیا ہے؟"

"میں تو یہی کہوں گی کہ ہم لوگوں کے سوائے اُس کا اور ہے ہی کون؟ کون سی ماں بہن یا کوئی رشتہ دار ہیں جو اُسے پکڑ کر کھلا دیں گے! کیا آپ اُسے نہیں جانتے؟"

شیام لال نے کچھ پریشان سا ہو کر کہا ——— "میرا اِن باتوں سے کوئی مطلب نہیں؟"

کہنے کو اتنی بڑی بات مُنہ سے نکال گئے۔ لیکن اندر ہی اندر پریشان بھی ہو رہے تھے۔ شیام لال کے مُنہ سے اتنی بڑی بات سُن کر نارائینی سُن ہو کر رہ گئی۔ وُہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کے ہونٹ ساتھ نہ دے رہے تھے فقط پھڑپھڑا کر ہی رہ گئے کچھ دیر چُپ رہ کر اُس نے خُود کو سنبھالا اور پھر رُندھے گلے سے بولی ——— "آپ تو جانتے ہی ہیں کہ تیرہ سال کی عمر سے جب لڑکیاں گُڑیاں کھیلتی ہیں اُس وقت ماں اِس گرہستی کا بوجھ میرے کندھے پر ڈال سورگ سدھار گئیں۔ اُس وقت رام اڑھائی سال کا تھا۔ اُوپر سے ماں جی ضرور دیکھ رہی ہونگی اور میں کس خوش اسلوبی سے گرہستی چلا رہی ہُوں۔ اِتنی بڑی ذمہ داری سنبھالنے میں چھبیس سال کی جوان عُمر میں ہی ادھ بوڑھی ہو چلی ہُوں۔ رام کو میں نے جنم تو اپنی کوکھ سے نہیں دیا ہے لیکن سگے بیٹے ہی کے مانند میں نے اُس کی پرورش کی ہے۔ اُسے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے۔ گوبند میں اور اُس میں کیا فرق ہے؟ آج آپ اُسے گھر سے نکال کر الگ کر رہے ہیں۔ آپ بیٹے کو ماں سے الگ کیسے کریں گے؟ میں آپ سے کہے دیتی ہُوں کہ اگر آپ نے میری گرہستی میں کچھ بھی گڑبڑ کی تو میں جا کر ندی میں ڈوب مروں گی تب ایک شادی اور کر لیجئے گا۔ رام کو علیحدہ کر دیجئے گا۔ جو آپ کی مرضی ہو کر بیٹھئے گا۔ نہ تو میں کچھ دیکھنے آؤں گی اور نہ ہی کچھ کہنے۔"

ایک سانس میں نارائینی اتنا کہہ کر چُپ ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ شیام لال دِل ہی دِل میں اُس سے خوف کھاتے تھے۔ اِس لئے پھر اُٹھ گیا

نے اَور کوئی بات نہ چلائی اور اِس طرح رام کو الگ کرنے کی بات وہیں کی وہیں اُس رات رہ گئی۔

دوسرے دِن رام کو نارائینی نے اپنی گود میں بٹھا کر پیار سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا ــــــ "رام تو یہاں نہ رہ سکے گا۔ تُو کہیں الگ جا کر رہ۔ الگ رہ سکے گا؟"

رام فوراً ہی ہنستے ہُوئے بولا ــــــ "کیوں نہ رہ سکوں گا بھابی تُم گوبند بھولا اور مَیں الگ رہیں گے۔ کب چلنا ہو گا؟"

یہ سُن کر نارائینی کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ کہتی بھی کیا؟ لیکن رام نے بات بند نہ ہونے دی۔ کہنے لگا ــــــ "بھابھی بولو نا؟ کب چلنا ہو گا ہمیں؟"

اِس کے جواب میں نارائینی نے رام کو اپنی چھاتی سے بھینچ کر کہا ــــــ "کیا تُو بھابھی کو چھوڑ کر الگ نہیں رہ سکتا؟"

رام نے نفی میں سر ہلا دیا۔

نارائینی ــــــ "اور بھابھی مر جائے تو ــــــ؟"

رام ــــــ "جاؤ بھابھی کیا کہتی ہو بھلا ــــــ؟"

"ابھی تو بھابھی کی بات تک نہیں سُنتا جب مر جاؤں گی ــــــ"

رام نے فوراً نارائینی کی بات کاٹ کر کہا ــــــ "کب میں نے تمہاری بات نہیں مانی ہے ــــــ؟"

نارائینی ــــــ "ارے تُو میری بات سُنتا ہی کب ہے؟ کِتنے دِنوں سے کہتی ہُوں کہ تُو میری ماں کی بے عزّتی نہ کیا کر۔ تُو سُنتا ہی نہیں ہے۔ اِس دفعہ تو میں ضرور کہیں چلی جاؤں گی۔"

رام نے مچل کر کہا ــــــ "مَیں بھی ساتھ چلوں گا۔"

نارائینی ـــــ "تجھ کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ میں کب چلی گئی۔"

رام ـــــ "اور گوبند ـــــ؟"

نارائینی ـــــ "وہ تیرے پاس رہے گا۔ تو ہی لکھا پڑھا کر اسے بڑا کرے گا۔"

رام ـــــ "نہیں یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

اِس بار نارائینی نے ہنس کر کہا ـــــ "تجھے ہی کرنا ہوگا رے۔"

رام کو جیسے اپنی بھابھی کی باتوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے بھی ہنس کر کہا ـــــ "سب جھوٹ ہے بھابھی۔ میں جانتا ہوں کہ تم کہیں نہ جاؤ گی۔"

نارائینی ـــــ "نہیں رے میں سچ کہتی ہوں ضرور کہیں نہ کہیں چلی جاؤں گی۔"

اِس دفعہ رام نے دکھی ہو کر کہا ـــــ "اگر تمہاری سب باتیں مانوں تو؟"

نارائینی ہنستے ہوئے بولی ـــــ "تب نہ جاؤں گی۔ اور نہ ہی تجھے گوبند کو لکھا پڑھا کر بڑا بنانا پڑے گا۔"

رام خوش ہوتے ہوئے چیخا ـــــ "اچھا تم دیکھنا بھابھی آج سے میں تمہاری سبھی باتیں مانوں گا۔"

آٹھ دن بڑے آرام سے گذر گئے۔

رام نے اپنی طرف سے کوئی بات نہ اُٹھنے دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ زیادہ تر دگمبری سے دور ہی دور رہنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن دگمبری اپنی سخت طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ کہنے سے چوکتی نہ تھی۔ وہ جب بھی موقعہ دیکھتی رام پر کچھ نہ کچھ طنز کر دیتی تھی۔

تیکھا طعنہ سُنا ڈالنے سے باز نہ آتی تھی۔ رام اِن باتوں سے بے نیاز سا ہو گیا۔ اگرچہ اُس دِن کی بھابھی کے کہیں چلے جانے کی بات پر اُسے اعتبار تو نہ تھا۔ لیکن بھی اُس کی سنجیدگی کے سبب اُس کے دِل پر ایک خوف ایک ہراس سا ضرور پھیل گیا تھا۔

لیکن شاید یہ چین اور رام کی چُپ قُدرت کو بُری محسُوس ہو رہی تھی۔ ایسا موقع آپڑا کہ رام اور دِگمبری میں ایک دفعہ جھڑپ ہو گئی۔ الزام ہمیشہ کے مانند رام ہی کے سَر تھوپا گیا۔

آج دِگمبری اپنے پِتا کا شرادھ کرنے کی تیاری میں تھی۔ اُس کے مرحُوم والد کی رُوح اَب تک تو اپنے لڑکے کے مکان میں سوئی پڑی تھی۔ لیکن اَب دِگمبری کے نار مُنی کے یہاں آجانے سے بیٹی اور داماد کے گھر میں اُس کا آواگون شروع ہو گیا تھا مطلب یہ کہ دِگمبری کو یہ سب باتیں خواب میں ہی دِکھائی دے رہی تھیں۔ کُچھ بھی ہو مرحُوم باپ کی بے چین رُوح کی شانتی کے لئے اُن کے شرادھ میں بارہ برہمنوں کو کھانے کی دعوت دی۔

صُبح کا وقت تھا رام باغیچے میں بیٹھا ماسٹر جی کے دیئے ہُوئے سوالات حل کرنے میں مشغُول تھا۔ اِسی دوران بھولا نے آکر چُپکے سے خبر دی کہ "بھگا با گدی اُس کے کارتک اور گنیش کو پکڑنے کے لئے جال لے کر گھاٹ پر گیا ہے۔ جلدی چل دیکھیں"۔

یہ کارتک گنیش کا قصّہ یُوں ہے کہ۔

کافی دنوں کی بات ہے دو موٹی موٹی بڑی بڑی روہُو ذات کی مچھلیاں گھاٹ کے پاس نہ جانے کہاں سے آکر برابر گھُومتی رہتی تھیں۔ رام برابر گھاٹ پر جاتا اور انہیں کُچھ نہ کُچھ کھلا آتا۔ اُس کا کہنا تھا کہ وُہ دونوں اُس کی پالتو مچھلیاں ہیں اُس نے اُن دونوں کا نام کارتک گنیش رکھ دیا تھا۔ تمام محلّے کے لوگ اِس بات سے واقف تھے۔ کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ ہو گا جس نے رام کے مُنہ سے اُن دونوں کارتک گنیش کی تعریف نہ سُنی

ہو۔ اور جو اس کی ضد پر اُسے دیکھنے نہ آیا ہو۔ علاوہ ازیں اُن مچھلیوں میں کیا خاصیتیں ہیں اور اُن میں کون کارتک اور کون گنیش ہیں یہ صرف رام ہی جانتا تھا۔ اُس کا ساتھی بھولا بھی اُنہیں ٹھیک طرح سے نہ پہچانتا تھا۔ اور غلط بتا دینے پر رام اُس کا کان کھینچ دیتا تھا

نارائینی بھی اِن باتوں کو جانتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ رام کے کارتک۔ گنیش اُس کے شرادھ کے دِن کام آئینگے۔

بھولا کی خبر سُن کر رام ذرا بھی متاثر نہ ہُوا اور وُہ خلاف توقع سلیٹ پر ہی جُھکا سوال حل کرتا ہُوا بولا —— "ایک بار بھگا اُنہیں پکڑ کر مزا دیکھتا۔ جال پھاڑ کر وُہ نِکل جائیں گے۔"

بھولا بولا —— "نہیں بھائی وُہ ہم لوگوں والا جال نہیں ہے۔ بھگا مچھروں سے اُن کا موٹا جال لایا ہے۔ وُہ کافی مضبُوط جال ہے۔ کارتک۔ گنیش اُسے پھاڑ کر نِکل نہیں سکتے۔"

یہ سُن کر رام سلیٹ رکھ کر بولا —— "چل دیکھوں تو۔"

بھولا کو ساتھ لے کر رام گھاٹ کے کِنارے آیا۔ اور اُس نے دیکھا کہ سچ مُچ اُس کے کارتک گنیش کو پکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بھگا گھاٹ کے کنارے لائی پانی میں پھینک کر جال پھیلائے مچھلیوں کو پھنسانے کی کوشش میں تھا۔

رام نے آتے ہی بھگا کو ایک دھکا دیا اور کہنے لگا —— "او مردود تو لائی پانی میں پھینک کر میری مچھلیوں کو پکڑ رہا ہے۔"

بھگا نے روتے روتے جواب دیا —— "بھیا جی بڑے بابو پکڑنے کا حکم دے گئے ہیں۔ دُوسری مچھلیاں آج مِلی نہیں۔"

رام نے اُس کی باتوں پر کچھ دھیان نہ دیا اور اُس کے ہاتھ سے زبردستی جال چھین کر پھینک دیا اور کہا —— "جا بھاگ جا یہاں سے۔ پھر کبھی میرے کارتک گنیش کی طرف

نظر اُٹھا کر بھی دیکھا تو بغیر خبر لئے نہ چھوڑوں گا۔"

بھگا نے جال اُٹھا لیا اور چُپ چاپ چلا گیا۔

رام گھاٹ سے واپس آ کر پہلے کے مانند پھر سلیٹ پنسل لے کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اِس بات پر وُہ خاموش ہی رہا۔ کیونکہ بھابھی سے وُہ وعدہ کر چکا تھا کہ وُہ آئندہ کوئی کسی قسم کا جھگڑا نہ کرے گا۔

دِگمبری آج جلدی سویرے اپنی پُوجا ختم کرنے میں لگی ہُوئی تھی۔ آج اُس کے دِل کی مُراد بر آنے کو تھی نا۔ دِگمبری نے بھی رام کے کارتک گنیش کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ اور وُہ اُنہیں گھاٹ پر دیکھ بھی آئی تھی۔ اُن دونوں مچھلیوں پر اُسی وقت سے اُس کی آنکھ لگی ہُوئی تھی۔ اِتنی خُوبصورت اور بڑی روہُو مچھلیوں کے لذیذ سر کا خیال ہی کر لینے سے اُس بیوہ دِگمبری کے مُنہ میں بھر آیا تھا۔ علاوہ ازیں اُس کا لالچ اپنے تک محدُود نہ تھا بلکہ وُہ تو خود اپنے ہاتھ سے بنا کر اِتنا لذیذ کھانا شرادھ کے موقع پر اُن مدعو کردہ براہمنوں کو کھلا کر ثواب حاصل کرنا چاہتی تھی۔

اِس ثواب کی اُمید کافی عرصہ سے اُس کے دِل میں تھی۔ کل شیام لال بابُو سے مچھلی کے بارے میں بغیر کارتک گنیش کا ذِکر کئے وعدہ کر چُکی تھی۔ اِس لئے اُنہیں مچھلیوں کو پکڑنے کے لئے بھگا کو ٹھیک کر رکھا تھا۔ اُس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وُہ مچھیروں کا موٹا جال لے کر اُسے پکڑے۔ اِس کے عوض اُسے چار آنے اِنعام دینے کا بھی وعدہ کیا۔ آج صُبح ہی وہ کارتک گنیش کو گھاٹ کے کِنارے گھومتی ہُوئی دیکھ آئی تھی۔ اُس نے بھگا کو ایک دفعہ پھر سب باتیں دوہرائیں۔ اِس لئے وُہ بڑے آرام سے بیٹھی تھی۔ اِدھر کِسی کو کانوں کان بھی خبر نہ تھی کہ رام کے کارتک گنیش ہی کو پکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سکیمیں بنائی جا رہی ہیں۔

اِدھر دِگمبری اپنی حسرت کے پُوری ہو جانے کی اُمید میں بیٹھی تھی کہ بِنیا نے آ کر تنہائی میں خلل ڈالا اور کہا کہ مچھلیاں تو مِلی نہیں اور بھگا کو جو مچھلیاں پکڑنے گیا تھا چھوٹے بابُو

نے مار پیٹ کر بھگا دیا ہے۔ اِتنا سُنتے ہی دِگمبری مارے غصّے کے پاگل ہو اُٹھی۔ اُسے بھلے بُرے کی تمیز بھی نہ رہی اور ہاتھ اُٹھا کر چلّائی ــــــ "میرا کتنا بڑا دشمن ہے یہ چھوکرا۔ جس دِن یہ مرے گا میرے مَن کو شانتی اُسی دِن ملے گی۔ ہے بھگوان تُم انتریامی ہو جانتے ہی ہو کہ میں ابھی تک برتی ہی ہُوں۔ ایک بُوند بھی جل نہیں ڈالا مُنہ میں اور اِسی طرح روز برابر رکھا کرتی ہُوں۔ اگر تُم سچے ہو اور میری یہ باتیں سچّی ہیں تو اے بھگوان دُوسری رات گذرنے سے پہلے ہی یہ پاپی اِس دُنیا سے چل بسے۔

کچھ ہی دُور نارائینی بیٹھی ترکاری کاٹ رہی تھی۔ دِگمبری کی یہ باتیں سُنتے ہی تلملا اُٹھی اور برق رفتاری سے اپنی ماں کے پاس آ گئی۔ سُوکھے پتّے کے مانند کانپتے ہُوئے فقط یہی کہہ پائی "ماں" اور ایک لفظ بھی اُس کے مُنہ سے نہ نکلا۔ نارائینی کے مُنہ سے اِتنی سنجیدگی اور دُکھ سے نکلا ہُوا لفظ "ماں" سُنکر دِگمبری کی چھاتی کا خُون ٹھنڈا ہو گیا۔ اور سکتہ طاری ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نارائینی کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی ندیاں بہہ نکلیں اور وُہ کچھ دیر اِسی طرح کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اپنے آنچل سے بہتے ہُوئے آنسوؤں کو پُونچھ کر وہاں آئی جہاں رام بیٹھا اپنا سوال حل کر رہا تھا۔

نارائینی نے بڑے سخت لہجہ میں کہا ــــــ "رام تُو نے مار پیٹ کر بھگا کو کیُوں بھگا دیا؟"

اچانک اِس حملہ سے گھبرا کر رام نے حیرت سے سَر اُٹھا کر دیکھا اور کچھ دیر بھابھی کے مُنہ کو دیکھتا ہی رہا۔ وُہ نارائینی کے اِس اچانک سوال سے اِتنا چکرا گیا کہ اُس کے مُنہ سے کوئی بات تک نہ نکلی۔ اُسے کچھ سُوجھ نہ پڑا۔ فوراً ہی وُہ سامنے والے دروازے سے باہر نکل گیا۔ نارائینی ابھی تک حقیقت سے انجان تھی۔ اُسے ذرا بھی خبر نہ تھی کہ یہ تمام سازش رام کے کارنک گنیش پکڑنے کیلئے کیجا رہی ہے۔ اُدھر نارائینی کے اچانک ایسے سوال سے رام اِتنا گھبرا گیا کہ اُس سے سب باتیں نہ کہہ سکا اور نارائینی حقیقت سے بے خبر رہی۔ گھر میں واپس آ کر اُس نے بھگا کو بُلوایا اور شرادھ کے لئے مچھلی پکڑ لانے کا حُکم دِیا۔

بس مُحکم بھر کی دیر تھی کہ بھگا بھاگ کر گھاٹ پر گیا اور وہاں پر گھومتے ہوئے کارتک گنیش کو جال میں پھنسا کر لے آیا۔ اور آنگن میں پٹک دیا۔

نارائینی رسوئی گھر کے دروازے پر کھڑی تھی۔ مچھلی دیکھتے ہی وہ چکرا گئی کچھ سوچ کر بھگا سے بولی ——— "اسے گھاٹ سے تو نہیں پکڑا ہے؟ کہیں یہ کارتک گنیش میں سے تو نہیں ہے؟"

بھگا نے اتنی بڑی مچھلی اتنی جلدی پکڑ لانے میں بڑی بہادری محسوس کی اور اسی گھمنڈ سے پھُول کر کہنے لگا ——— "جی ہاں ماجی۔ یہ گھاٹ کی مچھلی روہو مچھلی ہے بڑی مُشکل سے اِسے پکڑ پایا ہُوں۔"

نارائینی ——— "اور کیا تالاب میں مچھلی نہیں تھی جو تُو اِسے پکڑ لایا ہے"؟

بھگا کچھ بھی نہ سمجھ پایا لیکن پھر بھی اُس نے دِگمبری کی طرف اُنگلی سے اِشارہ کر کے کہا ——— "بڑی ماں جی نے تو اِس مچھلی کو پکڑنے کے لئے کہا تھا۔"

نارائینی افسوس میں ڈوبی ہوئی کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اگر وُہ جانتی تو کبھی بھی بھگا کو مچھلی پکڑنے کا حُکم نہ دیتی۔ اُسے اپنی غلطی پر بڑا افسوس ہُوا۔ اور وُہ اپنے کو مُجرم خیال کرنے لگی۔ نرت کالی کو بھی اگرچہ رام کی شرارتوں کی وجہ سے اُس کے خلاف شکایت رہتی تھی۔ لیکن دگمبری کی اِس کرتُوت پر اُسے بھی بڑا افسوس ہُوا۔ اپنی صاف گوئی کی عادت سے مجبُور ہو کر وہ دگمبری کو مخاطب کر کے کہہ ہی اُٹھی ——— "اچھا بڑی ماں جی گاؤں کا بچّہ بچّہ اِس کارتک گنیش کی کہانی سے واقف ہے۔ کیا آپ کو اِس کے بارے میں کچھ بھی خبر نہ تھی جو آپ نے اِس مچھلی کو پکڑ لانے کا حُکم بھگا بگری کو دیا۔ گاؤں میں تین چار تالاب ہیں کیا اُن میں مچھلی نہیں تھی؟ صرف اِس کو تو براہمن کھائیں گے اِس کے لئے اِتنی بڑی آدھے مَن کی مچھلی کی کیا ضرورت تھی۔؟ اِسے چُھپا دیجئے نہیں تو رام بہت بگڑے گا۔ کہیں ابھی نہ آ جائے۔"

دگمبری نے مُجرم کے مانند منہ لٹکا کر کہا ——— "او بابا۔ اتنی بڑی بات کا تو مجھے

ــــــ پتہ نہیں تھا۔ ایک مچھلی پکڑنے کی وجہ سے سب نے مل کر اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس کو چھپا کر رکھنے کی کہتی ہو۔ کیا براہمنوں کا بھوجن نہ ہوگا؟"

پنیا بولی ــــــ "بڑی ماں جی آپ کے براہمن کھائیں گے دو دیا اڑھائی بجے کے قریب۔ چھوٹے بابو کو اسکول چلا جانے دو۔ نہیں تو گھر میں قیامت اُٹھ کھڑی ہوگی۔"

"ارے بھولا کہاں ہے؟ ابھی تک یہیں کھڑا تھا۔ آخر گیا کہاں؟ معلوم ہوتا ہے وہ رام کو خبر کرنے گیا ہے۔ اب جو مرضی ہو کرو۔ کھڑے ہو کر اب سوچنے کا وقت نہیں"

بھگا نے چار آنے کے لالچ میں اتنی مچھلی پکڑ کر لا دی تھی۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی اس کے برعکس نظر آ رہا تھا۔ اس لئے چار آنہ وصول ہونے کی اُمید چھوڑ کر جال لے کر چلے جانے ہی میں اُس نے غنیمت سمجھی۔

بھولا رام کا پکا ساتھی تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ضرورت کے وقت کب کس وقت اور کہاں رام کو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ رام کے کارتک گنیش میں سے ایک کے مارے جانے کی خبر اُسی وقت دینے چلا گیا۔ باغیچہ کے جنوب کی جانب والے اُمرود کے درخت کے نیچے بیٹھے رام کے پاس پہنچ گیا۔ رام درخت کی ڈال پر بیٹھا نیچے پاؤں لٹکائے اُمرود کھا رہا تھا۔

ہانپتے ہانپتے بھولا نے رام سے کہا ــــــ "بھیا جی چلئے بھگا آپ کے کارتک کو مار لایا ہے"۔ رام نے اُمرود کھانا بند کر دیا۔ اُسے بھولا کی باتوں پر یقین نہ آ رہا تھا لیکن بھولا نے یقین دلاتے ہوئے کہا ــــــ "نہیں بھیا جی سچ کہتا ہوں۔ ماں جی نے ہی پکڑنے کا حکم دیا تھا۔ ابھی تک کارتک آنگن ہی میں پڑا ہے۔ چل کر خود دیکھ لو نا؟"

رام بھولا کی باتیں سن کر فوراً ڈال پر سے کود پڑا۔ اور بھاگا بھاگا آنگن میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ بھولا کی بات سچ نکلی۔ وہ اپنی مچھلی کو آنگن میں مُردہ پڑا دیکھ کر زور سے چلا اُٹھا۔ اور بڑے زور سے روتا ہوا بولا ــــــ "یہی تو میرے گنیش ہیں۔ او بھاگی

تُم ہی نے میرے گنیش کو حکم دے کر پکڑوایا ہے۔ اِتنا کہہ کر وُہ کٹے بکرے کی مانند زمین پر گر کر ہاتھ پٹک پٹک کر رونے لگا۔ ایک معمُولی سی مچھلی کیلئے بھگو کتنا گہرا زخم تھا۔ اس میں شاید دِگمبری کو کچھ شُبہ نہ رہا۔

مارے دُکھ کے رام نے دِن بھر کچھ نہ کھایا۔ چُپ چاپ اپنے کمرہ میں دِن بھر پڑا رہا۔ نارائینی نے رام کو کھانا کھا لینے کے لئے بہت کہا۔ اپنے ہاتھ سے کھلانے کی کوشش کی لیکن وُہ نارائینی کا ہاتھ بار بار ہٹا دیتا۔ کِسی طرح بڑی مشکل سے وُہ رام کے مُنہ میں دو چار نوالے ڈالنے میں کامیاب ہو سکی۔ رام بغیر کھائے ویسے ہی اُٹھ گیا۔

دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر دِگمبری نے شیام لال سے کہا ——— "تم ایک بار نارائینی سے کھا لینے کو کہو۔ نہیں تو کھانا نہیں کھائے گی۔ آج سارا دِن سے وُہ بھُوکی ہی ہے۔ شیام لال نے پُوچھا ——— "لیکن یہ کیوں؟"

دِگمبری نے اپنے لہجہ کو سوندھتا ہُوا اِتنا کر کہا ——— "مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے بیٹا۔ لیکن یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تالاب سے ایک مچھلی براہمن بھوجن کے لئے پکڑوالے لے کی وجہ سے اِتنا بڑا مہا بھارت اُٹھ کھڑا ہو گا۔"

شیام لال دِگمبری کے مقصد کو ٹھیک طرح سے سمجھ نہ سکے۔ اس لئے اُنھوں نے پنیا کو بُلا کر پُوچھا ——— "کیا بات ہے پنیا؟"

پنیا نے فوراً آ کر کہا ——— "جو مچھلی پکڑی گئی ہے وُہ چھوٹے بابُو کے گنیش ہیں۔"

اِتنا سُنتے ہی شیام لال کانپ گئے اُس نے پُوچھا ——— "رام کے ندی والے کہ رک گنیش میں سے ایک تو نہیں ہے؟"

پنیا بولی ——— "ہاں۔"

اب کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں سارا مُعاملہ وُہ سمجھ گئے۔ اُنھوں نے پھر پنیا سے پُوچھا ——— "معلُوم ہوتا ہے اِسی لئے رام نے کھانا نہیں کھایا ہے۔"

پنیتا ——— " جی ۔"

شیام لال ——— " تب نارائینی سے کہنے سے کچھ بھی نہ ہوگا ۔ جب رام نے ہنیں کھایا ہے تب وہ کیسے کھا سکتی ہے۔"

دگمبری پھر کہنے لگی ——— " بھیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اتنی بات بڑھ جائے گی تو میں براہمن بھوجن کی بات ہی نہ کرتی ۔ پھر نارائینی ہی نے تو مچھلی پکڑنے کی اجازت دی تھی ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خود حکم دے کر ایسا حال کرنے سے اُس کا کیا مطلب ہے ۔ یہ تو وُہی کہہ سکتی ہے ؟ نہ ہو بھیا جی ۔ ہم لوگوں کو کہیں اور بھیج دو ۔ اب تو اِس جگہ رہنے کو ایک لمحہ میں دِل نہیں مانتا ۔ میرے چلے جانے سے سب کو خوشی ہوگی اور پھر یہ روز روز کے جھگڑے بھی خود ختم ہو جائیں گے ۔"

کچھ دیر چپ رہ کر تریا چرتر کرتی ہوئی دگمبری پھر سے رونے والا ڈرامہ کھیلنے لگی ——— " بھیا جی یہ سب میرا ہی قصور ہے ۔ میرے ہی نصیب بُرے ہیں ۔ اگر اس طرح میری قسمت پھوٹی نہ ہوتی تو میرا بھائی ہی کیوں مرتا ۔ اور مجھے اپنے بیٹ کی لڑکی کے گھر لات جھاڑو کھا کر کیوں اپنی زندگی گذارنا پڑتی ؟ اے بھیا جی اب تو ہم بالکل ہی بے سہارا ہیں ۔ ہمارا اِس جہان میں اپنا کہنے والا کوئی نہیں ہے ۔ اب تم ہی کو ہمارا کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا ہی ہوگا ۔"

دِگمبری کی یہ سب باتیں سُن کر شیام لال پریشان ہو اُٹھا اور شش و پنج میں پڑگیا ہاں یا نہ کچھ بھی نہ کہہ سکا ۔

اپنے کمرہ کے دروازہ پر کھڑی نارائینی اپنی ماں کی سبھی باتیں سُن رہی تھی ۔ اُس کو خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ اُس کی ماں اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے اِتنی بے شرمی سے اُس پر الزام لگائے گی ۔ اپنے شوہر کے سامنے اپنی ماں کے اِس سلوک سے وُہ شرم سے پانی پانی ہو گئی ۔ زمین میں گڑ سی گئی ۔

سہج پیخ اُس رات رام نے پھر دروازہ نہ کھولا۔ نارائینی بے چاری بے بس ہو کر اپنا سا مُنہ لے کر اپنے کمرے میں لوٹ آئی اُداس اور غمگین ہو کر بستر پر پڑی رہی شیام لال اُس کمرہ میں بیٹھے سب سُن رہے تھے۔ نارائینی کو مایوس اندر آتے دیکھ کر کہنے لگے۔
—— "میں تو اِن آئے دِن کے جھگڑوں سے تنگ آ گیا ہُوں۔ اب مجھ سے اِتنی پریشانی برداشت نہیں ہوتی۔ اگر تُم اِس کا کچھ حل نہیں کرتیں تو جہاں میری مرضی ہو گی چلا جاؤنگا پھر تُم لوگ مجھے قصُور وار نہ کہنا۔"

شیام لال کی باتیں سُنکر نارائینی نے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن غم اور غصّہ کی شدّت سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اِس واقعہ کو دو تین دِن گذر گئے۔ لیکن پھر بھی رام کا غصّہ ٹھنڈا نہ ہُوا تھا۔ سارا گھر اُسے اپنا دشمن دِکھائی دینے لگا۔ یہاں تک کہ اُس نے بولنا تک بند کر دیا۔ کھانے پینے تک کے لئے وُہ کسی سے نہ کہتا۔ اُس کے اِس سلُوک سے نارائینی اندر ہی اندر پریشان اور رنجیدہ سی رہنے لگی۔

شام کا وقت تھا۔ دِگمبری ندی میں نہانے گئی ہوئی تھی۔ وُہ نہا بھی رہی تھی اور دُنیا بھر کی کتھائیں اپنی پڑوسنوں سے کہتی بھی جا رہی تھی۔ وُہ رام کی بُرائی خوب کر رہی تھی۔ اور اِس بات میں نارائینی کو خطاوار بتا کر اُسے بے وقوف لڑکی بنایا۔ اپنے متعلق بھی وُہ بہت لمبی چوڑی باتیں بنا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کس طرح وُہ اپنے بھائی کی گرہستی کی پُوری پُوری حقدار تھی۔ اُس کا بھائی اُس سے بغیر پُوچھے ایک تنکا بھی اِدھر سے

اُدھر کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ اور اُس کی عمر کوئی زیادہ نہیں ہے اُس کے یہ بال غم اور فکر سے اِتنی جلدی پک گئے ہیں۔

اِسی طرح کی بے کار سی باتیں کرتی ہوئی وہ پڑوسنوں کے ساتھ گھر کی طرف آرہی تھی کہ راستہ میں اُسے رآم کی ایک نئی شیطانی کی خبر لگی۔ بھلا رآم کے خلاف کوئی بات سُن کر وہ چُپ رہ سکتی تھی؟ بھاگی بھاگی جیسے ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر وہ گھر آپہنچی اور آنگن میں پہلا قدم رکھتے ہی چِلّا کر بولی ——— "اے نارائینی کچھ اپنے لاڈلے دیور کی بھی کرتُوت سُنی ہے تُو نے؟

اِدھر شام ہو چلی تھی۔ اور صبح کا گیا رآم ابھی تک سکول سے لوٹ کر نہیں آیا تھا جیسے جیسے آفتاب کا نور مدھم ہوتا جا رہا تھا ویسے ہی نارائینی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اِسی دوران اپنی ماں کے منہ سے یہ الفاظ سُن کر اُس کا رہا سہا حوصلہ بھی جاتا رہا۔ بڑی سنجیدگی سے بولی ——— "کیا ہو گیا ہے ماں؟ رآم نے کیا کر ڈالا ہے؟"

ڈگمبری بولی ——— "نہانے گئے ہیں وہ لوگ۔ اور پھر جائیں گے بھی کیوں نہیں اِتنا نالائق لڑکا ہے کہ کیا کہوں؟ میں نے سات جنم بھی اِتنا شرارتی لڑکا نہیں دیکھا ہے"۔

رآم کی بُرائی سُن کر جیسے اُس کے منہ اور آنکھوں سے مسرت ٹپکی پڑتی تھی اور جیسے وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔

نارائینی کو نہ تو ماں کی باتیں اچھی لگیں اور نہ ہی اُس نے کچھ جواب ہی دیا۔ اُس نے پنیا کو بُلا کر کہا ——— "او پنیا۔ دیکھ رآم ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ جا کر بھولا کو بھیج دے"۔

سب باتیں سُننے کے لئے پنیا ڈگمبری کے پاس کھڑی تھی اور اُسے اسی طرح کھڑی دیکھ کر نارائینی پھر بولی ——— "تُو ابھی تک یہیں کھڑی ہے۔ میں نے رآم کا پتہ لگانے کو کہا ہے نا؟"۔ پنیا نہ چاہتے ہوئے بھی چلی گئی۔

ڈِگمبری نے ایک بڑی لمبی اور گہری سانس لی۔ جیسے ایک سانس ہی میں وُہ سب کچھ کہہ جائے گی۔ کہنے لگی ــــــ "کیا ہُوا ہے تُو جانتی ہے نارائینی؟"

نارائینی نے اُس کی باتوں پر کچھ دھیان نہ دے بڑی لاپرواہی سے قطع کلام کرتے ہُوئے ٹوکا۔ "ماں پہلے تُم بھیگا کپڑا تو اُتار دو بعد میں سب باتیں کہہ دو گی تو کچھ حرج نہ ہو گا۔" اِتنا کہہ کر وُہ وہاں سے ہٹ گئی۔

لیکن ڈِگمبری حیران ہو کر مُنہ بچکاتے ہُوئے بڑبڑائی ــــــ "ارے واہ! اِس کل کی لڑکی غصہ تو دیکھو اِس وقت رام کی اِتنی بڑی بات نہ کہہ سکنے کی وجہ سے اُسکا پیٹ پھُولنے لگا۔"

بات یہ تھی کہ رام کے سکول میں اُسی گاؤں کے زمیندار کا لڑکا بھی پڑھتا تھا۔ آج دوپہر کو کھانے کی چھُٹی کے وقت اُس میں اور رام میں ایک بیکار سی بات پر بحث ہونے لگی۔ چُونکہ اُس بات کا کوئی سرا اور پیر نہ تھا اِس لئے اُس کا کچھ فیصلہ نہ ہو سکا اور نتیجہ یہ ہُوا کہ دونوں میں مار پیٹ ہونے لگی۔

زمیندار کے لڑکے نے کہا تھا ــــــ "شاستروں میں لکھا ہے کہ شمشان کالی کی طاقت رکشا کالی سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ شمشان کالی کی جیب زبان بہت لمبی ہے۔"

رام نے اُس کے خلاف دلیل دیتے ہُوئے کہا ــــــ "نہیں نہیں کبھی نہیں۔ یہ سراسر غلط ہے شمشان کالی کی زبان ضرور ہے۔ لیکن نہ تو اِتنی بڑی ہے اور نہ ہی اِتنی چوڑی۔

کچھ ہی دِن پہلے گاؤں میں جوڑ جوڑ چندہ کر کے رکھشا کالی کی پُوجا کی گئی تھی۔ اِسی سلسلہ میں ماں کالی کی ایک مُورتی بھی ستھاپنا کی گئی تھی۔ رام کو اُسی کا اس وقت خیال آیا۔

لیکن زمیندار کے لڑکے نے رام کی باتوں سے متفق نہ ہوتے ہُوئے کہا ــــــ "نہیں رکھشا کالی کی زبان اِتنی بڑی ہے"۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر زبان کی لمبائی چوڑائی بتا دی۔

رام نے غُصہ میں دونوں ہاتھ پھیلا کر زبان کی لمبائی چوڑائی بتاتے ہُوئے کہا ــــــ "اِتنی ہی بڑی صِرف نہیں۔ دیکھ اِتنی بڑی۔ اِتنی چھوٹی زبان ہونے سے کیا کبھی وُہ تمام زمین

کی رکھشا کر سکتی ہے۔ تمام دُنیا اُن کی حفاظت کرنیکی وجہ سے تو اُن کا نام رکھشا کالی پڑا۔"
اِس کے بعد دونوں میں کچھ تُو تُو مَیں مَیں ہوئی۔ انجام کار آپس میں گھونسے بازی شروع ہو گئی۔ زمیندار کا لڑکا تھا کمزور۔ ناک سے ایک بوند خون زمین پر گر گرا۔
بس اتنی ذرا سی بات کا بتنگڑ بن گیا۔ آج تک اِس چھوٹے سے سکول میں کبھی اتنی بڑی بات ——— زمیندار کے لڑکے کا پٹنا کبھی نہ ہوئی تھی۔ اِس لئے اِس ڈرامہ نے ایک بہت بڑا اہمیت صورت اختیار کر لی۔ علاوہ ازیں مار کھانے والا تھا زمیندار کا لڑکا ہی۔ اور سکول بھی تھا زمیندار کا ہی۔ اِس لئے سکول کے ہیڈ ماسٹر اُس لڑکے کو لے کر زمیندار کی کچہری میں جا حاضر ہوئے۔ اور زمیندار سے سبھی باتیں سلسلہ وار کہہ دیں۔ اِدھر رام اِتنی سی بات کا بتنگڑ بنتے اور نازک صورت اختیار کرتے دیکھ کر فوراً ہی وہاں سے ہوا ہو گیا۔
بھولا جو پنّیا کے کہنے پر اُسے کھوجنے نکلا تھا اُس کو کہیں نہ پا کر گھر لوٹ آیا۔ اور خبر دی کہ چھوٹے بابو کا کہیں پتہ نہیں۔"
کافی دیر بعد شیام لال مُنہ لٹکائے ہوئے گھر میں آئے اور آنگن ہی میں کھڑے ہو کر بولے ——— سُنتی ہو جی؟ معلوم ہوتا ہے رام کی وجہ سے اب مجھے اِس گاؤں سے نکل جانا ہو گا۔ نوکری کر کے چار پیسے لے کر گھر آتا تھا۔ اب اُس کا بھی سہارا گیا سمجھو۔"
شیام لال کی آواز سُن کر نارائینی باہر آئی اور سر کا کپڑا ذرا ماتھے پر کھینچ کر بولی ——— کیا وہ لوگ تھانہ گئے تھے؟"
شیام لال نے سر ہلا کر کہا ——— "نہیں" مالک تو دوسرے بھگوان ہیں۔ دیوتا ہیں۔ معاف کر دیا۔ لیکن اور بھی تو گاؤں کے لوگ ہیں۔ سب اُن کے مانند تو رحمدل نہیں ہیں۔ روز روز اگر وہ اِسی طرح ایک نیا فساد کھڑا کرتا رہا تو ہماری کب تک عزت بنی رہے گی۔ کسی نہ کسی دن تو ناک کٹ کر ہی رہے گی۔ اب تمہیں بتاؤ ایسی حالت میں کب تک گاؤں میں پاؤں گا۔ رام کہاں ہے؟

نارائینی نے بتایا ـــــــ "وہ گھر ابھی تک نہیں لوٹا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ڈر کے مارے کہیں چھپا بیٹھا ہے"

شیام لال نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ـــــــ "بھاگنے اور نہ بھاگنے سے کیا ہوتا ہے اب ہمیں اُس سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ میری سوتیلی ماں کا لڑکا ہے۔ لوگ کسی بات کو لیکر ہماری ہیکڑی نہ کریں۔ اِس لئے میں اب تک اُس کی شرارتیں بیہودگیاں برداشت کرتا رہا ہوں لیکن اب میں اور برداشت کرنے میں لاچار ہوں۔ کم سے کم اپنی عزت اور جان تو بچانا ہی ہوگی"

رسوئی گھر کے دروازہ پر بیٹھی دِگمبری شیام لال کی سبھی باتیں سُن رہی تھی وہیں سے کہہ اُٹھی ـــــــ "بھیّا یہ باتیں تو ٹھیک ہیں۔ لیکن اپنے لڑکے کی طرف تو دیکھنا چاہیئے"۔

شیام لال ذرا جوش سے کہنے لگے ـــــــ "ہاں ماں جی ضرور دیکھنا چاہیئے۔ میں کل ہی گاؤں کے پنچوں کو اکٹھا کرکے اُن کے سامنے زمین اور جائیداد وغیرہ سب دے کر الگ کردونگا"

پھر اُنھوں نے نارائینی کی طرف دیکھ کر کہا ـــــــ "اور تم بھی سُن لو اِس بات کو لے کر اب اُسے ٹیک ٹک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو وہ اچھا سمجھے کرے۔ اچھا ہی سمجھ کر تو اُس نے مالک کے لڑکے پر ہاتھ اُٹھایا تھا"

اِن سب باتوں کو سُن کر دِگمبری خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ وہ پھر بولی ـــــــ "نارائینی کس لئے اُس پر حکم چلانے جاتی ہے یہ دیکھ کر تو میرا دل کانپ کانپ جاتا ہے۔ وہ اُجڈ اور گنوار لڑکا ہے۔ جب میری ہی بے عزتی کرنے سے نہیں چوکتا تو نارائینی کس کھیت کی مولی ہے۔ وہ مردود نارائینی کو تنکے کے برابر بھی نہیں گنتا۔ کسی دن اُسی کی بھی بے عزتی نہ کردے مجھے بھی ڈر ہے۔ پھر یہ اُس کے لئے ہے ہی کون سی بڑی بات؟ میں تو کہتی ہوں اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ رام کے چکر میں اب پڑنے کی ضرورت نہیں"۔

شیام لال کو اپنی ساس کی یہ باتیں سُنکر شاید بڑی شرم محسوس ہوئی۔ اِس لئے اُنھوں نے پھر اِن باتوں کا ذکر نہ کیا اور اِتنا ہی کہہ کر چُپ ہو گئے "جو میں کہے دیتا ہوں کہ اب اُسے کچھ

کہنے کی ضرورت نہیں "۔

نارائینی پتھر کا بُت بنی کھڑی رہی۔ اور سب کچھ خاموشی سے سُنتی ہی رہی۔ شوہر اور ماں کا ایک ایک لفظ اُسے جگر میں تیر کی مانند پیوست ہو رہا تھا۔ لیکن اُس نے ایک بات کا بھی جواب نہ دیا۔ چُپ چاپ سر جُھکا کر اپنے کام کو چلی گئی۔

شب کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی تھی۔

قریب ایک گھنٹہ بعد پنیا نے آکر نارائینی سے کہا ——— "ماں جی چھوٹے بابو جی آئے ہیں اور اپنے کمرے میں چُپ چاپ بیٹھے ۔ ۔"

نارائینی بغیر کسی طرح کا کوئی لفظ کہے ہُوئے وہ چپ چاپ اُٹھ کر رام کے کمرہ میں آئی۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ رام تخت پر بیٹھا گھٹنوں میں مُنہ چھپائے جانے کیا سوچ رہا تھا کہ دروازہ بند ہونے کی آواز سُن کر چونک اُٹھا۔ سر اُٹھا کر دیکھا کہ اُس کی بھابھی دروازہ بند کر کے اُسی کونے میں رکھی پتلی چھڑی ہاتھ میں لئے کھڑی ہے۔ بھابھی کے اِس رُوپ کو دیکھ کر وہ چکرا گیا۔ فوراً کُود کر ایک کونے میں جا کھڑا ہُوا۔

نارائینی چلاّ کر بولی ——— " چل اِدھر آ "۔

رام نے ہاتھ جوڑ کر کہا ——— " اِس دفعہ چھوڑ دو بھابھی اب بدمعاشی نہیں کرونگا"

نارائینی نے خُود کو سخت بناتے ہُوئے کہا ——— "اِدھر چلا آ سیدھی طرح۔ نہیں تو یہ چھڑی تیری پیٹھ کا چمڑہ ہی اُدھیڑ کر رکھ دے گی"۔

رام اُسی کونے میں کھڑا ہاتھ جوڑ کر التجا کرتے ہُوئے بولا ——— "اب کبھی بھی نہیں کرُوں گا بھابھی۔ تم اِس بار صرف اِس بار معاف کر دو۔ مَیں سچ کہتا ہُوں بھابھی مَیں کان پکڑتا ہُوں۔ اب کبھی ایسا نہ کروں گا"۔

اُسے قریب آتے نہ دیکھ کر خُود تخت پر چڑھ گئی اور پُورے زور سے ایک چھڑی اُسے جما دی۔ اِس کے بعد تو پھر بوچھاڑ ہونے لگی۔ پہلے تو رام نے دروازہ کھول کر بھاگ جانے

کی کوشش کی۔ لیکن نارائینی کی چھڑی کچھ اِس تیزی سے اُس پہ پڑ رہی تھی کہ اُس کے لئے بھاگ جانا بڑا مشکل ہو گیا۔ آخر رام نارائینی کے پاؤں پر گِر کر زور زور سے رونے لگا"
رونے کی آواز سُنکر پنیا نے پیچھے سے کھڑکی میں آکر جو یہ منظر دیکھا تو مارے دُکھ کے رو پڑی اور کہنے لگی ۔۔ ۔۔۔۔ "ماں جی اب اُسے چھوڑ دو۔ یہ میری ہی غلطی ہے جو میں نے ۔۔۔۔
لیکن ڈِگمبری جو کھڑکی پر کھڑی تھی۔ جسکی چھاتی رام کی یہ حالت دیکھ کر خوشی سے پھُولی جا رہی تھی۔ پنیا کو ڈانٹ کر بولی ۔۔۔۔۔۔ "تو کیوں ہر معاملہ میں ٹانگ اڑاتی ہے۔ نوکرانی ہے، نوکرانی کی طرح رہ"

اِسی دوران شیام لال دروازہ پیٹتے ہُوئے بولے ۔۔۔۔۔۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ساری رات مار پیٹ ہوتی رہے گی؟"
شیام لال کی آواز سُن کر نارائینی نے چھڑی پھینک دی اور دروازہ کھول کر چُپ چاپ اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ ڈِگمبری کا وہاں کھڑے رہنا اُسے بہت بُرا لگا۔ ڈِگمبری اُس کے قریب کچھ کہنے آئی۔ لیکن نارائینی بڑی جلدی دِکھاتے ہُوئے بغیر کسی کے پاس رُکے چلی گئی۔

رام کھانا کھانے بیٹھا تھا۔
ڈِگمبری بھی اُس سے تھوڑی دُور بیٹھی تھی۔ رام کے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کرتے ہُوئے بولی ۔۔۔۔۔ "اِتنے بڑے لڑکے کو مارنا پِیٹنا کوئی اچھی بات ہے؟ اس کے بڑے بھائی نے تو آجتک اُس کے جسم پر ہاتھ بھی نہیں لگایا کل رات کی مار پیٹ بڑی بیجا ہُوئی تھی۔
پنیا کو ڈِگمبری کی یہ چِکنی چُپڑی باتیں ذرا بھی پسند نہ آئیں۔ کہنے لگی ۔۔۔۔ "بڑی ماں جی

"آپ بھی تو کسی سے کم نہیں ہیں اور پھر سب آپ ہی کی تو لگائی بجھائی ہے۔ کیا جھوٹ سچ نہیں لگایا ہے آپ نے؟ آپ ہی نے پٹوایا تھا چھوٹے بابو کو۔ آپ ہی فساد کی جڑ ہیں"۔

کل کیا پٹنا تو رام کو بھی اچھا نہ لگا تھا۔ لیکن مارنے والی اُسکی بھابھی تھی نا۔ اسی لئے وُہ چپ رہا نہیں تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ لیکن بنیتا کے مُنہ سے۔ فساد کی جڑ دِگمبری ہے۔ سُن کر وُہ آپے سے باہر ہو گیا۔ آنکھیں لال کر کے دِگمبری کی طرف گھورتے ہوئے بولا ——— "یہ ڈائن بڑھیا ہمارا سب کچھ کھانے آئی ہے"

یہ سُنکر دِگمبری نے نارائینی کو پُکارا ——— "نارائینی او نارائینی اپنے دیور کی بات سُنتی جا"۔

نارائینی اسوقت گھاٹ پر نہانے جا رہی تھی، ماں کی آواز سُنکر بولی ——— "ماں اب میں کچھ نہیں سُن سکتی۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا۔ سچ کہتی ہوں اب مجھے مر کر ہی چین ملے گا۔

پھر رام کی طرف دیکھ کر بولی ——— "کیوں رے بندر۔ ابھی تو تیری پیٹھ کا درد بھی نہیں مٹا ہوگا ابھی سے ہی ساری مار بھول گیا اور لگا پھر شرارتیں کرنے ———" رام نے کوئی جواب نہ دیا چپ چاپ سر جھکا کر کھانا کھاتا رہا۔ نارائینی نے بھی کچھ اور نہ کہا۔ اپنی دھوتی کندھے پر رکھ ندی کو چل دی۔

صحن کے ایک کونے میں ایک امرود کا درخت تھا جو آنگن سے صاف دکھائی دیتا تھا بھات کھا کر رام اس امرود کے درخت پر چڑھ گیا اور کچے پکے کی تمیز امرود کھانے لگا کسی کو آدھا کسی کو صرف دانتوں ہی سے کاٹ کر وُہ صحن میں پھینکنے لگا یہاں تک کہ ایکدم کچے امرود بھی وُہ نہیں چھوڑ رہا تھا۔ رسوئی گھر کے دروازہ پر بیٹھی دِگمبری یہ سب کچھ دِل ہی دِل میں کڑھ رہی تھی، نارائینی ابھی تک ندی سے لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ جب دِگمبری اپنے تئیں روک نہ سکی۔ اور کہا ——— "بیٹا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچے امرود منہ لگانے کو بھی نہیں ——— یہ کچے امرود توڑ کر کھانا کیا اچھی بات ہے ———؟"

رام اور دِگمبری میں جیسے بلی کتے کی سی دُشمنی تھی روز بروز سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ رام کو دِگمبری کی باتیں تیر کی مانند چُبھتی سی محسوس ہوتی تھیں، اسوقت دِگمبری کا بولنا اسے بچھو کا سا ڈنک مارنے لگا۔ اس نے درخت پر سے ہی کہا ——— "ٹھیک کر رہا ہوں بڑھیا ———"

دِگمبری سب کچھ سُن سکتی تھی۔ لیکن بڑھیا کا خطاب اُسے قطعی پسند نہ تھا۔ پھر رام کے مُنہ سے سُنکر تو وہ اور بھی بھڑک اُٹھی۔ بڑے ہی سخت لہجے میں بولی ——— تُو مجھے بڑھیا کہتا ہے؟ اچھا اسے نہا کر

آجائے دے۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے تھوڑے ہی مانتے ہیں۔ دیکھو تو کتنا بے حیا لڑکا ہے۔ اُس دن کی مار سے پیٹھ کی چمڑی اُدھڑ گئی پھر بھی ہوش نہیں آیا اسے۔ بے شرم کہیں کا ——"

اُسکی باتوں کا رام نے امرود کے درخت پر سے ہی جواب دیا —— "چڑیل بڑھیا کہیں کی"

دگمبری —— "چڑیل بڑھیا، چھوٹا منہ بڑی بات کہتا ہے یا جی حرامزادہ کہیں کا۔ اُتر نیچے ابھی بتاتی ہوں تجھے ——" رام نے اوپر سے ہی جواب دیا ۔۔۔ "کیوں اُتروں؟ تیرے باپ کا درخت ہے؟"

باپ کا نام سُنکر تو دگمبری کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ زور زور سے چلائی —— "اب تیرے باپ تک پہنچنے لگا۔ سُنتی ہے بیٹیا ——" اُسی وقت نارائینی گھاٹ سے نہا کر لوٹ آئی۔ درخت پر نظر پڑتے ہی بولی ۔۔ "رام کھانا کھا کر سکول کیوں نہیں گیا۔ درخت پر کیوں چڑھا ہوا ہے۔"

رام کو نارائینی کے اتنی جلدی لوٹ آنیکی ذرا بھی اُمید نہ تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ نارائینی جب راستے میں ہوگی تو اُسے آتا دیکھ کر درخت سے اُتر کر بھاگ جائیگا۔ لیکن دگمبری کے ساتھ جھگڑے میں پڑ کر وہ راستہ پر نظر نہ رکھ سکا۔ اور نارائینی صحن میں آکر ایکدم کھڑی ہو گئی۔ نارائینی کو دیکھتے ہی وہ گھبرا گیا۔ ڈرتے ڈرتے بولا —— "امرود کھا رہا ہوں ——"

نارائینی —— "یہ تو دیکھ رہی ہوں۔ لیکن تو سکول کیوں نہیں گیا ——"

جب رام کو کوئی بہانہ نہ سوجھ پڑا تو جھٹ سے بول پڑا —— "میرے پیٹ میں درد ہے بھابھی!"

نارائینی ۔۔۔ "اسی لئے کچے امرود کھائے جا رہے ہیں ۔۔۔؟"

اِدھر دگمبری اپنی لڑکی نارائینی کی آواز سُن کر صحن میں دوڑی آئی اور رام کی شکایت کرتے ہوئے کہنے لگی —— "سُنتی ہو نارائینی یہ حرامزادہ میرے باپ تک پہنچنے لگا ہے۔ کچے امرود توڑ کر آنگن میں پھینک رہا تھا۔ میں نے روک کے درخت سے اُترنے کو کہا تو کہنے لگا —— "کیوں اُتروں تیرے باپ کا درخت ہے کیا؟ ——"

نارائینی نے غصہ سے آنکھیں سُرخ کر کے رام سے پوچھا —— "کیوں رے تو نے ایسا کہا ہے کیا باپ کا نام لیا؟"

رام —— "نہیں بھابھی! میں نے کچھ بھی نہیں کہا ہے ——"

دگمبری بولی ۔۔۔ "حرامزادہ جھوٹا کہیں کا۔ کیا تو نے باپ کا نام نہیں لیا۔ بیٹیا نے بھی سُنا ہے"

ستہ جد عجیب : تھنگ سے منہ بنا کر مٹکتے ہوئے بولی —— بے حیا کہیں کا۔ اُس دن کی مار بھول گیا۔

جب پیٹھ پر چھڑی سٹاسٹ اور پٹاپٹ پڑنے لگی تھی تو کیسے مُنہ سے نکل رہا تھا۔ میں ایسا نہ کرونگا
"پاؤں پڑتا ہوں بھابھی، مر جاؤنگا بھابھی" اسوقت تو سوائے اسکے اور زبان سے کچھ نکلتا ہی نہ تھا۔
اسوقت کیا پٹاپٹ زبان لڑا رہا ہے بے شرم کہیں کا ———"

اب رام سے برداشت نہ ہو سکا۔ ایک تو ویسے ہی چوبیس گھنٹے اُسکے دل میں ڈگمبری کے خلاف آگ جلتی رہتی تھی اور اُس پر اس طرح کی تیر کے مانند چبھنے والی باتوں نے اور بھی اُوپر تیل چھڑک دیا کی تیز بنا دی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا کچا امرود تھا۔ اُس نے وہ امرود بغیر ادھر اُدھر دیکھے ڈگمبری کی طرف چلا دیا۔ لیکن خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے نشانہ چوک گیا اور وہ امرود ڈگمبری کو لانگ کر پیچھے کھڑی نارائینی جو ابھی تک وہیں کھڑی تھی کی دائیں آنکھ کے اُوپر آکر بڑے زور سے لگا۔ چوٹ شدید لگی چہرہ درد سے نارائینی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ وہیں بیٹھ گئی۔ پنیا بھی کام چھوڑ کر دوڑی دوڑی آئی۔ نارائینی کو سہارا دیکر اُس کے کمرہ میں لے آئی ——— رام کو اسکی ذرا بھی اُمید نہ تھی۔ غصہ میں آکر اُس نے بغیر سوچے سمجھے امرود چلا دیا تھا لیکن اسکا اتنا بڑا نتیجہ دیکھ کر اسکا دل دھک سے رہ گیا
محسوس کرنے لگا۔ لیکن اسے اسوقت کچھ نہ سوجھا اور وہ وہاں سے کود کر باہر کی طرف بھاگ گیا۔

دوپہر کے وقت جب شیام لال کھانا کھانے آئے تو انہیں آج کے واقعہ کی خبر ملی اُنہوں نے دیکھا کہ نارائینی تکلیف سے بڑی کراہ رہی ہے اُسکی دائیں آنکھ کی پُتلی کے درمیان چوٹ لگنے سے بند ہو گئی ہے۔ چوٹ لگی ہوئی جگہ کالی ہو رہی تھی اور اُس جگہ کو پنیا سینک رہی تھی۔ شیام لال یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوگئے۔

شیام لال کو دیکھ کر ڈگمبری آج دروازے کی اوٹ میں کھڑی نہ ہوئی بلکہ سامنے آکر روتے ہوئے بولی
———"بھیا جی رام نے نارائینی کو مار ڈالا ہے"——— اُنہوں نے ڈگمبری کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور نارائینی کے پاس جاکر اُسکی چوٹ کو دیکھا چوٹ نہایت تکلیف دہ معلوم ہوئی وہ سنجیدہ ہو کر نارائینی سے بولا ———"تمہیں میری قسم ہے تم آج سے اُس مردود کے ساتھ کسی قسم کا بھی تعلق نہ رکھو اگر تم آج سے اُس سے بات کرو اور اُسکو کھانے کو دو تو تمہیں میرے سر کی قسم ... نارائینی یہ بات سُن کر برداشت نہ کر سکی اور قطع کلام کرتے ہوئے کہنے لگی ———"چپ رہئے، چپ رہئے ایسی بات زبان پر نہ لائیے"
شیام لال نے جھلا کر کہا ——— "میں کچھ نہیں جانتا اگر تم میری اتنی بڑی قسم نہ مانو تو میرا سر کھاؤ

منہ دیکھو ـــــ" اِتنا کہہ کر شام لال خود ہی ڈاکٹر کو بُلانے چلے گئے۔

رام سارا دِن ندی کے کنارے کنارے گھومتا رہا ـــــ بھابھی کو چوٹ کافی لگی ہوگی۔ اور پھر اُسی کے ہاتھ سے۔ بڑی بے چینی تھی اُسکے دِل میں۔ کبھی وہ خیال کرتا ـــــ جس ہاتھ نے امرود چلا کر بھابھی کو مارا ہے اُسے کیوں نہ کاٹ ڈالے اسی طرح بڑے عجیب غریب خیالات اُسکے دماغ میں گھومنے لگے آوارگی میں تمام دِن کٹ گیا اِسی اُدھیڑ بُن میں نہ تو اُسے بھوک ہی لگی اور نہ اُس نے خود ہی کچھ کھانا چاہا۔ آہستہ آہستہ آفتاب بھی غروب ہو گیا اور شفق کی لالی نے ایک عجیب سا سماں بنا دیا کافی اندھیرا ہو جانے پر وہ گھر میں گھُسا۔ نہ معلوم کیسے اُس کے دِل کو کیا محسوس ہو رہا تھا اس وقت۔

مکان میں گھُستے ہی اُسے عجیب بدلتی ہوئی گھر کی حالت معلوم ہوئی اُس نے دیکھا کہ کاٹے ہوئے بانسوں ایک بڑی باڑ لگا کر صحن کے بیچوں بیچ سے گھر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ رام نے اچھی طرح ہلا کر دیکھا وہ بانسوں کی دیوار کافی مضبوط تھی اور اسکا توڑنا بہت مشکل تھا۔ صحن سے ہوتا ہوا وہ رسوئی گھر میں آیا۔ ہاں اُس نے دیا جلتے ہوئے پایا اور باہر ہی گردن بڑھا کر چُپ چاپ اُس نے اندر کا حال چال دیکھنا چاہا۔ گھر میں تو کوئی دکھائی نہ دیا۔ لیکن پیتل اور کانسی کے برتنوں کا ڈھیر ضرور وہاں پڑا تھا۔

یہ برتنوں کا ڈھیر ایکدم خاموشی اور صحن کے دو حصے یہ معاملہ کیا ہے اُسکی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ پھر اُسے اس بات میں ذرا بھی شک نہ رہا کہ صبح کے ڈرامہ سے اِس معاملہ کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ صبح کا منظر، بھابھی کو چوٹ لگنا اور اُسکا سر پکڑ بیہوش سا ہو جانا اُسکی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اُسکا دِل ایکبار کانپ اُٹھا اور اپنے کمرے میں لوٹ لگا اور بیٹھک کے دوسرے حصہ کی آہٹ سُننے کی کوشش کرنے لگا وہ اپنی کھوجی تجربہ لگا

رات کچھ زیادہ نہیں بیتی تھی کوئی نو بجے کا وقت ہوگا بھوک سے وہ بے چین ہو کر لاچار ہو کر اُٹھا اور دوسرے حصے میں جانیوالے دروازے کو کھٹکٹایا۔ بینیا نے آکر دروازہ کھولا اور الگ کھڑی ہوگئی

رام نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا ـــــ "بھابھی کہاں ہیں بینیا ـــــ؟"

بینیا ـــــ "اپنے کمرے میں سوئی ہوئی ہیں ـــــ"

رام بھابھی کے کمرہ میں آیا۔ اُس نے دیکھا کہ بھابھی تو چپ چاپ چادر اوڑھے لیٹی ہیں اور نیچے چٹائی بچھا کر [illegible]

گوبند کو اپنے چچا رام سے بہت پیار تھا۔ رام کو دیکھتے ہی وہ اپنا کھیل چھوڑ کر چچا کے پاس دوڑ آیا۔
اور چچا کے دونوں ہاتھ پکڑ بچوں کے مانند جھولتے ہوئے بولا ——"چچا تمہارا گھر اُس طرف ہے۔ اِدھر
ہمارا گھر ہے۔ بابوجی نے کہا ہے کہ اگر تم اِس گھر میں گھسوگے تو تمہارے پاؤں توڑ دوں گا۔"

رام نے گوبند کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اِنہیں باتوں کو سوچتا ہوا چپ چاپ نارائینی
اُسکے پیروں کی طرف بیٹھ گیا۔ اُسکے بیٹھتے ہی نارائینی نے اپنے پاؤں سکوڑ لیے اور دوسری طرف
کروٹ بدل لی۔ رام کچھ بولا نہیں۔ لیکن دِگمبری کو رام کی موجودگی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اُس نے
اپنی چھوٹی لڑکی سورو سے کہا ——"سرو۔ بول نہ تیرے چچا جی نے کیا کہا ہے؟ کہدے نہ اِس سے؟"

سردھنی رٹائے ہوئے فقرے بول گئی ——"چچا جی نے کہا ہے آپ یہاں مت آئیے۔ کل سویرے۔ کیا ماں؟"

ماں ——"زمین جائیداد کا بٹوارہ ——"

سردھنی (اپنے کہے ہوئے فقرے کو مکمل کرتے ہوئے) "کل صبح پنچوں کو بلا کر آپکی زمین جائیداد کا بٹوارہ کر دیا
جائے گا ——" دِگمبری نے اُسے گھورتے ہوئے کہا ——"قسم کھلانے کی بات تو کہہ نا بیوقوف کہیں کی"

سردھنی —— "چچا جی نے دیدی کو قسم دیدی ہے نہ آپکو کھانا دینگی نہ بات ہی کرینگی۔ چچا جی نے یہ بھی کہا ہے"
نارائینی کو سردھنی کی یہ باتیں بالکل پسند نہ آئیں اور اُس نے بیچ ہی میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔
——"اچھا ہو گیا۔ اب بس بھی کر۔"

سردھنی تو چپ ہو گئی لیکن دِگمبری کب ماننے والی تھی فوراً بول اُٹھی ——"بات تو ٹھیک ہی ہے بیٹا
تم تو کسی کو ادھمرا کر ڈالو۔ اور وہ کچھ بولے بھی نہیں؟ کچھ بھی ہو میں تو اُسے غلط نہیں کہہ سکتی۔ اب آخر وہ قسم بھی
نہ کھلاتے تو کیا کرتے۔ اب تو تمہارا اِس گھر میں کھانا پینا اور اُٹھنا بیٹھنا اور نہیں چل سکتا۔ کیونکہ تم جب چاہو کسی
کا خون کر سکتے ہو۔ پھر نارائینی کو بھی اپنے شوہر کی قسم کا خیال تو رکھنا ہی ہوگا ——"

اُسی وقت سردھنی ماں سے بولی ——"ماں چلو نا کھانا نہیں دوگی کیا؟ مجھے بھوک لگی ہے۔"
دِگمبری سردھنی کے اس طرح ٹوکنے سے جھلا گئی ——"ٹھہر نا لڑکی۔"

رام ساری باتیں بت کے مانند بیٹھا سنتا رہا۔ اُس وقت اگر گھر میں آگ بھی لگ جاتی تو

وہ اُس وقت نہ اُٹھ سکتا تھا۔ شائد اُس سے وہاں سے اُٹھا بھی نہ جاتا۔ اپنے دل میں ایک طرف تو

رونما آ رہا تھا۔ لیکن دُوسری طرف دِگمبری کی زبان کی چبھتی ہُوئی باتیں بھی انتقام کی آگ کو بھڑکا رہی تھیں اِسی جھگڑے رگڑے میں ایکدفعہ بھی وُہ نارائینی کے سامنے نہ سسک سکا تھا اُسکی آنکھیں ایکبار بھی ساون بھادوں نہ برسا سکی تھیں ابھی بھابھی کے آنچل میں مُنہ چھپا کر اتنا ہی کہہ سکنے کیلئے ــ "بھابھی اب کرو لگا اُسکی زبان تک نہ کھلی، یہ چھوٹا سا جُملہ جانے کتنی دفعہ ایسے وقت اُسکی حفاظت کر چُکا تھا۔ آج ایسی خراب حالت میں بھی یہ الفاظ اُسکی زبان پر نہ آ رُکے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گلے تک آتے ہی جیسے کوئی اُسکی زبان پر تالا لگا رہتا ہے ـــ رام کو اسطرح بالکل چُپ چاپ بیٹھا دیکھکر نارائینی نے سردی سے کہا ـــ "اِسے چلے جانے کو کہدو۔"

اِس دفعہ رام نے اپنی سسکی کو روکتے ہُوئے کہا ـــ "ہاں اِسے جانیکو کہدو۔ معلوم ہوتا ہے مُجھے بھوک لگتی ہی نہیں ہے نا۔ صُبح کا کھایا ہُوا ہیں نے ـــــ؟"

نارائینی ذرا تیز ہو کر بولی ـــ "جان سے مارنی کیوں ڈالا؟ پھر پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ مَیں کچھ نہیں جانتی۔ جا بِنیتا کے پاس ـــ"

رام ـــــ "میں نہیں جاتا بِنیتا کے پاس کِسی کے پاس نہیں جاؤنگا میں بھُوکے ہی سو جاؤنگا"

اِتنا کہکر رام جھلا کر زمین پر پاؤں پٹکتا سارا گھر کو سر پر اُٹھاتا اپنے حصے کی طرف چلا آیا اور آکر زمین پر بِچھی ہُوئی چٹائی پر آکر لیٹ گیا ـــ تھوڑی دیر بعد بِنیتا کچھ کھانیکو لیکر رام کے کمرے میں آئی رام اپنے دونوں ہاتھوں میں مُنہ چھپا کر لیٹا ہُوا تھا۔ بِنیتا کھانے کی تھالی زمین پر رکھ کر رام سے مخاطب ہُوئی ـــ "چھوٹے بابو! اُٹھے کھانا کھا لیجئے"

اُسکی آواز سُنتے ہی رام جھٹ سے اُٹھ بیٹھا اور اُسکو لال آنکھیں دِکھلاتے ہُوا بولا ــ "تو یہاں کیوں آئی ہے؟ دُور ہو جا میری نظروں سے۔ میں تیری صُورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا میرے گھر سے چل جا۔ مَیں تیرا کھانا نہیں کھاؤنگا۔ لیجا یہاں سے۔ اِتنا کہہ کر رام نے تھالی بِنیتا کی طرف دھکیل دی۔

بِنیتا کھانا رکھ کر گرتے پڑتے پاؤں لوٹ گئی۔ لیکن رام نے تھالی، اور گلاس اُٹھا کر پھینکدیا برتن جھن جھن کرتے ہُوئے صحن میں جا گرے ـــ صُبح شیام لال کے کچہری چلے جانیکے بعد رام اپنے صحن میں آکر یہ کہتے ہُوئے چہل قدمی کرنے لگا ـــ "میں کوئی قسم وسم نہیں مانتا۔ اُونہہ آگئے بڑے قسم کھلانیوالے، وُہ ہوتے کون ہیں قسم دینے والے؟ کیا ہمارے اپنے بھائی ہیں؟ وُہ میرے کوئی نہیں ہیں۔ اُنکی بات میں نہیں مانتا۔ میں نے بھابھی کو تھوڑے ہی مارا تھا اُس بڑھیا کی اِن [illegible]

لگ گیا تھا اور اسکے لئے کوئی کون قسم کھلاتا ہے؟ اُس حصّہ کے سب لوگ اِن باتوں کو اچھی طرح سن رہے تھے لیکن جواب کسی نے نہ دیا۔ کچھ دیر ٹھہر کر رام نے پھر بکنا شروع کیا ۔۔۔ "ٹھیک ہی تو ہے! سب اچھا۔ نہ بات چیت کریں اور نہ کھانے کو دیں۔ میں کسی سے مانگنے بھی نہیں جاتا۔ بڑے آرام سے دال روٹی ترکاری وغیرہ اچھی اچھی چیزیں بناؤنگا اور بڑے مزے سے پیٹ بھر کر اکیلے ہی ڈٹ کر کھاؤں گا۔ جب میری کسی کو پرواہ نہیں تو میں بھی کسی کی فکر کیوں کروں؟ میں بھی آج سے نہ تو کچھ مانگونگا اور نہ بولونگا۔ اس میں میرا کچھ نقصان تھوڑے ہی ہوجائیگا"۔۔۔۔۔ اِن باتوں کو کہہ کر رام جواب کے انتظار میں تھوڑی دیر تک رکا رہا۔ لیکن اُدھر والوں نے اُن باتوں کا کچھ جواب نہ دیا۔ تب رام نے بھولا کو آواز لگائی ۔۔ "او بھولا۔ بھولا رے۔ اِدھر آ"۔

رام کے آواز لگانے پر بھولا وہاں کا کام کاج چھوڑ کر رام کی طرف چلا آیا اور کہنے لگا ۔۔۔۔۔ "چھوٹے بابو کیا حکم ہے؟"۔۔۔۔۔۔ رام نے اُس سے کہا ۔۔۔۔ "دیکھو بھولا۔ تو اب میرا نوکر ہے اس گھر میں آپ پاؤں بھی نہ رکھنا۔ اور اِس بات کا بھی خیال رہے کہ میری اِجازت کے بغیر کوئی بھی اِس گھر میں گھسنے نہ پائے اور اگر کوئی زبردستی کرے تو اسکی ٹانگ توڑ دینا۔ سمجھ گیا نا بھولا۔ اور ہاں دیکھو بیٹیا بھی اس مکان میں نہ گھسنے پائے۔ وہ اُس گھر کی خادمہ ہے نا؟ اچھا اب آ میرے ساتھ۔ ہم لوگ مزے سے اچھی اچھی چیزیں بنائینگے اور ڈٹ کر کھائینگے"

اِتنا کہہ کر رام بھولا کو لئے رسوئی گھر میں آیا اور تھال لوٹا وغیرہ برتن جھن جھن بجا کر بڑے زور شور سے کھانا بنانے کی تیاری کرنے لگا۔ ساتھ ہی اُس نے بھولا کو پہلے چاول اچھی طرح لانے کا حکم دیا اور بھولا چاول دھونے چلا گیا۔۔۔۔۔۔ نارائینی اِس حصے میں رسوئی گھر کے دروازے میں بیٹھی ہوئی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ لیکن متلون مزاج دلگیری کو کہاں چین تھا وہ دروازہ کی دراز سے بڑے غور سے رام کے حصے کی ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد نارائینی کے پاس آکر مُنہ کی ہنسی بیکار دبا کر کھس کھس کر بتانے لگی ۔۔۔ نارائینی دیکھو تو بابو کتنی عقل کا مالک ہے۔ وہ لوگ بڑھیا بڑھیا کھانے اور ترکاری بنا کر کھائینگے۔ چولھے پر اُس نے ایک بڑی سی پتیلی کی بٹلوئی میں لبالب چاول بھر کے چڑھا رکھی ہے اِس پر مزا یہ ہے کہ پانی برائے نام بھی نہیں ڈالا۔ صرف چاول دھو کر ہی ڈال رکھے ہیں۔ دیکھتی ہے نارائینی یہ کھانا بنا رہا ہے۔ بٹلوئی میں اِتنا چاول بھی کوئی بھرتا ہے؟ پھر پانی نہ ہونے سے کیا چاول جلکر کوئلہ نہ ہوجائینگے۔ علاوہ ازیں کھائینگے دو آدمی اور بھات بنایا جا رہا ہے محلے بھر کیلئے۔ اِس پر دماغ یہ ہے کہ کہتا ہے اُسے برجیا

کھانا بنانا آتا ہے۔ آج پچاس سال سے زیادہ ہُوئے مجھے رسوئی بناتے ہُوئے۔ لیکن کبھی اس بات کا غرور نہیں کیا۔ کبھی اپنے مُنہ سے یہ نہیں کہا کہ مجھے کھانا بنانا بہت اچھا آتا ہے۔ مَیں تو چاول اِتنا بڑھیا تیار کرتی ہُوں کہ کوئی بھی بڑی آسانی سے ایک ایک دانہ الگ الگ کر سکتا ہے۔ میں تو اتنا ناپ کے پانی دیتی ہوں کہ دوبارہ دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کوئی میرے ساتھ رسوئی کرنیکی شرط لگائے تو۔ اگر کھانے والے میری رسوئی کی تعریف نہ کریں تو کہنا۔"

دِگمبری کی اپنی اس جھوٹی تعریف سُنکر نارائینی نے مُنہ جھکا دیا اور اپنی گردن دوسری طرف پھیر لی لیکن سُننا کبھی کم نہ تھی وہ قریب ہی کھڑی سب کچھ سُن رہی تھی۔ اسکے علاوہ دِگمبری کچھ کہے اور سُننیا نہ بولے یہ نا ممکن تھا، وہ کہہ ہی تو بیٹھی ـــــ "یہ لو، واہ بڑی ماں جی۔ آپ اپنا مقابلہ کل کے دُودھ پیتے بچے سے کر رہی ہیں اور کبھی آج تک اُس نے خود ایک گلاس پانی بھی ہاتھ سے نکالکر پیا ہے جو آج کھانا پکاکر کھلائے گا"

نرت کالی اس گھر کی بڑی پُرانی خادمہ تھی وہ رام کی ماں ہی کے وقت سے اِس گھر میں کام کر رہی ہے۔ نارائینی گُڑیا سی بچی ہُوئی بہو بنکر اُس گھر میں آئی تھی۔ نارائینی اور رام سے اُسے بہت پیار تھا۔ اُسے دِگمبری کا اِس طرح رام کے پیچھے پڑکر گھر سے نکلوا دینا ذرا بھی پسند نہ تھا وہ اُسی وقت سے کچھ نہ کچھ کہنے کا موقع ڈھونڈھ رہی تھی اِسی لئے اُس نے اِس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

اپنی ماں کی دیکھا دیکھی سُردھنی بھی کبھی کبھی جا کر دروازے کی دراز سے رام کے جھنے کا حال چال دیکھ لیتی تھی۔ قریب گھنٹہ بھر بعد وہ اپنی بڑی بہن کے پاس آ اُسکا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہُوئی بولی ـــــ "او دیدی آؤ چلیں۔ چلکر ذرا دیکھو تو۔ رام بھیا کچا بھات کھا رہے ہیں۔ ساتھ میں بھی کچھ نہیں ہے۔ صرف بھات ہی کھا رہے ہیں۔ اچھا دیدی۔ کیا کچا بھات کھانے سے پیٹ درد نہیں کریگا رام بھیا کا۔"

سُردھنی کی باتیں سُنکر دُکھ سے نارائینی کا دل بھر آیا لیکن رو نہ سکی۔ اب اُس سے بیٹھا نہ گیا وہ سُردھنی سے ہاتھ چھڑا کر اپنے کمرہ میں آ بستر پر گر پڑی۔ اُسکا دِل اسوقت اِتنا دُکھی تھا کہ الفاظ میں طاقت نہیں جو بیان کر سکے۔ رہ رہ کر اُسے یہی خیال آتا تھا کہ رام جو اُسکے پیٹ کے لڑکے کی ہی طرح ہے آج بھوک سے بے چین ہو کر اُسکے ہی سامنے کچا بھات کھا رہا ہے۔ اور وہ اِتنی لاچار ہے کہ کچھ کر بھی نہیں سکتی۔ اِنہیں سب باتوں کو سوچتے سوچتے گزر گیا۔ اُس کی حالت بد سے بدتر اور زیادہ تکلیف دہ ہوتی چلی گئی۔

دوپہر کے وقت شیام لال کے کھانا کھاکر چلے جانیکے بعد دِگمبری نارائنی کے کمرہ میں آئی اور کہا
—— "او نارائنی چل۔ جو کچھ ہو تھوڑا بہت کھا لے۔ چوٹ کی وجہ سے تھوڑا بخار تو ضرور آگیا ہوگا
لیکن کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ میں کہتی ہوں تھوڑا سا کھا لینے سے کچھ نقصان نہ ہوگا۔ چل اُٹھ بیٹھ"

نارائنی پائنتی پڑی چادر کو اور بھی اچھی طرح سے لپیٹ کر بال سے بولی —— "ماں مجھے
پریشان نہ کرو۔ چپ چاپ مجھے سونے دو۔ میں کچھ کھانا نہیں چاہتی۔ تم جاکر کھا لو۔"

دِگمبری —— "چل بھات نہ کھاؤ۔ روٹیاں ہی تلی تلی تیار کردوں گی۔ چل آؤ ——"

نارائنی —— "نہیں میں کچھ نہ کھاؤں گی —— — —"

دگمبری —— "کیا کہتی ہے نارائنی۔ کل سے تو نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ نہیں کھانے سے کیسے
چلے گا؟ ابھی تو سارا دن پڑا ہے۔ اُٹھ روٹی ہی کھا لے۔ —"

نارائنی نے اپنی ماں کی بات کا کچھ جواب نہ دیا اور چپ چاپ پڑی رہی۔ لیکن بِندیا بار
کھڑی دِگمبری کا یہ سب دِکھاوے کی باتیں دیکھ رہی تھی۔ نارائنی کے چپ ہونے پر وہ بول اٹھی
—— "بڑی ماں جی آپ بیکار کہہ کر سر درد مول لے رہی ہیں۔ اگر یہاں کھڑی رہ کر آپ رات دن
چلاتی رہیں تو بھی انہیں اُٹھا کر نہ کھلا پائینگی۔ چوٹ کی وجہ سے بخار آگیا ہوگا۔ اسلئے ذرا چین سے
ماں جی کو گھنٹے دو گھنٹے سو لینے دیجئے جس سے انہیں کچھ آرام ملے۔"

دِگمبری کو بِندیا کا بولنا پسند نہ آیا۔ وہ کمرہ کے باہر جاتی ہوئی کہتی گئی "تم لوگوں کے کھیل تمہیں
لوگ جانو یا بابا میری سمجھ میں تو کچھ۔ ہاں چوٹ کی وجہ سے ذرا بخار سا آگیا ہوگا۔ کیا اتنی ذرا سی بات کیلئے کوئی
دِن رات فاقہ کر کے اس طرح پڑا رہتا ہے۔ مجھ سے تو بابا یہ سب نہیں دیکھا جاتا۔"

شام کے وقت نارائنی برآمدے میں آکر بیٹھ گئی۔

رام اب تک سکول سے لوٹ آیا تھا۔ اپنا بستہ کتابیں جہاں تہاں پھینک۔ وہ گاؤں کی دوکان
سے چبینا خرید لایا اور دونوں جیبوں میں بھر کر آنگن میں گھوم گھوم کر کھا رہا تھا۔ صبح ہی کے مانند
وہ اب بھی باڑ کے پاس آکر اس گھر والوں کو زور زور سے سنا کر کہنے لگا ——

[illegible] منہ سے چبینا

کھا رہا ہوں۔ میرا کیا۔ میں تو اب بڑے آرام سے کھاؤں گا اور رہوں گا ــــــــ"

رسوئی گھر میں دیا جلا کر رام کھانا بنانے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن کچھ دیر بعد رام رسوئی گھر سے نکل آیا اور صحن میں کھڑا ہو کر چلّانے لگا ــــــ "میرا چاقو کہاں ہے؟ میں ترکاری کس سے کاٹوں گا؟ میرے حصّے کا سِل بٹّہ کہاں ہے۔ میں مصالحہ کس پر پیسوں گا؟"

تھوڑی دیر بعد پتیا نے جواب دیا۔ ــــ "ماں جی نے کہا ہے کہ کل چاقو اور سِل بٹّہ خرید کر بھجوا دیا جائیگا"

رام ــــ "نہیں میں خریدا ہوا سِل بٹّہ نہیں چلتا۔ میں کچھ نہیں جانتا" اِتنا کہہ کر رام پاؤں پٹکتا ہوا رسوئی گھر سے چلا گیا۔ ــــ تھوڑی دیر بعد پھر آنگن میں آ کر اُس نے بولنا شروع کر دیا ــــ "کیوں میرے گنتش کو پکڑوا منگوایا ہے کیوں اِس بڑھیا نے میرے پیچھے پڑ کر مجھے الگ کروایا۔ میں نے تو ٹھیک کیا جو اُسے گالی دی۔ پھر گالی دونگا اور خوب دونگا۔ ڈائن بڑھیا۔ کالے منہ والی۔ ہمارے گھر میں ہمارا سب کچھ کھاتے اور اُجاڑنے آئی ہے۔ یہ ڈائن بڑھیا مر جائے جلدی۔ اور اگلے جنم میں چڑیل بنے ــــ ــــ !!!"

اپنی شان میں اِتنے خوبصورت خطابات سُنکر دِگمبری جل کر کوئلہ ہو گئی اور اُچھلتی ہوئی نارائینی سے بولی ــــ "سُنتی ہے نارائینی یہ سب زبردستی آنکھ میں اُنگلی گھسیڑ کر لڑنا نہیں تو اور پھر کیا ہے؟ یہ لڑکا مجھے چڑیل کہتا ہے۔"

نارائینی نے اِسے سُن کر بھی نہ سُنا اور باغیچے کی طرف منہ پھیر لیا۔ اور اُسی طرف دیکھتی رہی۔ ایسا ظاہر کرتے ہوئے جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔

دوسرے دِن رام کی حالت میں ایک خاص تبدیلی سی آ گئی۔ اُس کا چلّانا چلّا کر اِس طرف کے لوگوں کو پاگل بنانا بالکل بند ہو گیا۔ آج وہ حیران و ششدر تھا۔ جیسے اُس کے دِل میں خوف کا بھوت گھس گیا ہو۔ اِس واقعہ کو ہوئے دو دِن گذر چکے تھے اُس کی بھابھی نے اُس کو نہ تو بلایا تھا اور نہ ہی اُس کو کھانے کو دیا تھا۔ یہاں تک کہ اُسے بلا کر جھاڑ بھی نہیں بتائی۔ اگر اُسے بلا کر

جھاڑ بتا دیتی یا دو چار تھپڑ ہی رسید کر دیتی تو شاید اُسے اِتنا دُکھ محسوس نہ ہوتا۔ جتنا کہ اِس

وقت اُسے یہ علیحدگی اَور نہ بولنا پریشان کر رہے تھے۔ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا ہے۔ اپنی بھابھی کا اس طرح کا سلوک اُس نے کبھی نہیں دیکھا۔

اُسے رہ رہ کر اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اور ایسی غلطی کے لئے وُہ باورچی خانے کے دروازے میں بیٹھ کر طرح طرح کے بیان دیتا رہا۔ ایک بار اُس نے کہا —— "میں نے بھابھی کو مارنے کے لئے اَمرود تھوڑا پھینکا تھا۔ وُہ تو میں نے بلّی کو مارا تھا۔ لیکن اُن کو لگ گیا۔" پھر وُہ بولا —— "میں تو یُونہی اَمرود اِدھر اُدھر زمین پر پھینک رہا تھا۔ لیکن درمیان میں بھابھی آگئی۔ ڈر کر میرا ہاتھ بہک گیا اَور اُسکی پیشانی پر اَمرود جا لگا۔" ایک بار اُس نے کہا —— "میں نے کبھی کو بھی گالیاں نہیں دی تھیں۔" پھر بولا —— "میں نے تو گوبند کو گالیاں دی تھیں۔" اِسی طرح وُہ بہت دیر تک بغیر سر پیر کی کہتا رہا۔ مگر مانند سابق کے آج بھی اُسکی باتوں کا جواب اِس طرف سے کسی نے نہ دیا ہاں یا نا —— جیسے اُس طرف سے کوئی سُن ہی نہیں رہا تھا۔

ایک بار اُس نے بڑی تکلیف کے ساتھ شرم ترک کر کے یہاں تک کہہ ڈالا —— "اب نہیں کرونگا معافی مانگتا ہُوں۔" جب اِس بات کا بھی کوئی جواب نہیں ملا تو مارے دُکھ کے وُہ رو پڑا۔ وُہ بار بار سوچنے لگا کہ وُہ کس طرح اپنی بھابھی کو خوش کرے۔ جب بھابھی نے ہی جو اِس کی ماں کی جگہ ہے، اِسطرح سے الگ کر دیا ہے تو وُہ اب کہاں جائے؟ کس کے پاس اور کس طرح جا کر رہے یہ اُسکی سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ آج نہ ہی تو اُس نے کھانا تیار کرنے کی کوشش کی اَور نہ وُہ سکول ہی گیا۔ مارے رنج کے نہ تو اُسے کچھ سُوجھ ہی رہا تھا۔ اَور نہ ہی وُہ اپنے آپ کو کسی کام کرنے کے لائق پا رہا تھا۔ جب وُہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ تو چُپ چاپ پڑ کر سو رہا۔ دِن میں بھی اُداس رہا۔

اِدھر نارائینی کو بھی اِن سب باتوں کا بیحد دُکھ تھا۔ رام کو وُہ اپنے لڑکے کے مانند ہی مانتی تھی۔ اُسکے دیکھتے ہی دیکھتے رام کھانے پینے کیلئے اس قدر تکلیف اُٹھا رہا تھا اَور وہ نہ جانے کیسے برداشت کر رہی تھی۔ اُسکو بہت دُکھ تھا۔ کل دِن بھر وُہ سب سے چھُپ کر روتی رہی۔ اور ایک دِن پہلے اُس کو بُخار آ گیا تھا۔ اِس کے علاوہ دُکھ کی وجہ سے اُس سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں جاتا تھا۔ آج دوپہر کے وقت ... کسی طرح ... نارائینی کے پاس آئی وُہ

نارائینی سے دُودھ پینے کیلئے اصرار کرتی ہُوئی بولی ـــــ "اُٹھ نارائینی تھوڑا سا دُودھ پی لے بغیر آب و دانہ کے کیا اپنی جان دے دیگی۔ تجھے یہ دُودھ پینا ہی پڑے گا ـــــ"

نارائینی کو اِنکار کرنے میں بڑی شرم سی محسُوس ہُوئی وُہ "نہ" نہ کر سکی۔ چُپ چاپ اُٹھ کر اُس نے ماں کے ہاتھوں سے دُودھ کا کٹورا لے لیا۔ اَور اُس میں سے تھوڑا سا دُودھ پی کر کٹورہ پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔ اِس طرح بجھے دِل سے دُودھ پی کر وُہ کروٹ بدل کر سو گئی۔

رات کے نو بجے کے قریب جلدی جلدی قدم اُٹھاتی ہُوئی بِنیتا نارائینی کے پاس آئی اَور آہستہ سے کہا ـــــ "بی بی جی! رات کافی ہو چکی ہے۔ لیکن چھوٹے بابُو جی کی طرف گھر اُسنسان ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا"

نارائینی چونک کر اُٹھ بیٹھی اور بِنیتا کو گلے لگاتی ہُوئی بولی ـــــ "بِنیتا! اب تُو ہی دیکھ آکہ وُہ کہاں ہے۔ مکان کے اَندر ہے یا کہ نہیں"۔

بِنیتا کی بھی پلکیں بھیگ گئیں اور وُہ اپنے آنچل سے نارائینی کی آنکھیں پُونچھتی ہُوئی بولی ـــــ

"بی بی جی! چھوٹے بابُو کل سے ہی بُہت ناراض ہیں۔ اِس لئے مُجھے اُن کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوتی لیکن آپ گھبرائیں نہیں میں ابھی بھولا کو بھیج کر اُن کا پتہ منگاتی ہُوں"۔

اِتنا کہہ بِنیتا بھولا کی تلاش میں چلی آئی۔ صحن میں جنگلے کے پاس آکر اُس نے بھولے کو آواز دی بھولا دروازے میں بیٹھا تھا۔ بِنیتا کے بُلانے پر وُہ اُس کے پاس آیا، اور اُسکے استفسار کرنے پر اُس نے اُسے بتایا کہ رام اپنے مکان میں سو رہا ہے۔ یہ سُنکر نارائینی نے اطمینان کا سانس لیا اور بھگوان کا شکریہ ادا کیا۔

دُوسرے دِن صُبح ہونے سے پہلے ہی نارائینی بیدار ہُوئی اَور اپنے کل کے بُخار کی رتی بھر پرواہ نہ کرتے ہُوئے حوائجِ ضروری سے فراغت حاصل کر کے بڑی محنت سے کھانا تیار کرنے لگی۔ وُہ جب آدھا کام ختم کر چکی تو دِگمبری اُٹھ کر اُس کے پاس آئی۔ نارائینی کا اِس طرح سے کھانے پینے کی بُہت سی اشیاء تیار کرتے دیکھ کر وہ بڑی حیران ہُوئی۔ اُس نے بڑی ہی کرخت آواز میں نارائینی سے کہا ـــــ "تُو تو کل بُخار کی وجہ سے سُر ڈھالے پڑی تھی نا؟ اِس کے علاوہ تُو نے تین دِن سے کچھ بھی نہیں کھایا آج تُو اتنی سویرے کس خوش قسمت کے لئے اتنی چیزیں تیار کر رہی ہے؟ میں پُوچھتی ہُوں نارائینی! یہ سب کیا ہو رہا ہے ـــــ"

نارائینی نے بڑی نرم آواز میں جواب دیا ۔۔۔ "ہاں آپ دیکھ تو رہی ہیں کہ کھانا تیار کر رہی ہوں"
"وہ تو سب دِکھائی دے رہا ہے۔ مگر یہ سب کس کی خاطر اور کیوں ہو رہا ہے؟ کیا اب تجھے میرے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں ہے؟"

نارائینی نے جیسے دِلگبری کی یہ بات سُنی ہی نہیں اُس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چُپ چاپ اپنا کام جاری رکھا۔

کل رام دِن بھر اپنے کمرے میں لیٹا ہُوا طرح طرح کی باتیں سوچتا رہا۔ رہ رہ کر اُس کو یہی خیال آتا تھا کہ بھابھی کو گہری چوٹ لگی ہے یہاں تک کہ وہ چوٹ کا نتیجہ جاننے کیلئے ایک کچا امرود لے آیا اور وہ بار بار اپنی پیشانی پر مارنے لگا۔ اس سے بھی جب اُس کو تسلی نہ ہُوئی تو وہ یہ سوچنے لگا کہ اُس نے بھابھی کو دانستگی یا نادانستگی کے عالم میں مارا تو ضرور ہے اور اِس سے اُنکو چوٹ بھی لگی ہے اور کافی چوٹ لگی ہے نہیں تو اِس طرح سے وہ سر تھام کر بھلا بیٹھ کیوں جاتیں۔ اگر وہ کونسا کام کرے کہ جس سے یہ کلنک دُھل جائے اور اس کی بھابھی خوش ہو جائے۔

کافی دیر سوچتے رہنے کے بعد اچانک اُسے ایک بات یاد آئی۔ کچھ دن پہلے بھابھی نے اُس سے کہا تھا کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ اُس کے نہ کہنے پر بھابھی نے پھر کہا تھا کہ تب وہی کہیں چلی جائے گی اور اُسے گوبِند کو لکھا پڑھا کر آدمی بنانا پڑیگا۔ آخر یہی بات اُسے جچی۔ کہ اگر وہاں سے کہیں چلا جائے تو اُسکی بھابھی ضرور خوش ہوگی ۔۔۔۔ اب وہ جائے تو جائے کہاں؟ اُس نے یہ سُن رکھا تھا کہ اُسکے ماموں تارکیشور کے پاس کہیں رہتے ہیں۔ لیکن ٹھیک کہاں رہتے ہیں، اسکے متعلق اُس کو کچھ علم نہ تھا۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ یہاں سے تارکیشور کی طرف چلا جائے گا اور وہیں کہیں اُسکے ماموں کا مکان ہوگا جسکو کہ وہ تلاش کر لیگا۔ لیکن یہاں تارکیشور تک پہنچنے کیلئے بھی تو کچھ پیسوں کی ضرورت ہوگی اور اُس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ اِسکے لئے اُس نے یہی سوچا کہ بھابھی سے اگر مانگا جائے تو وہ ضرور ایک یا دو روپیہ دیدینگی اِسطرح سے یہاں سے چلے جانے کا آخری فیصلہ کر کے اُٹھا اور بھولا کو آواز دی۔ اسی دوران اُس نے ضروری اشیأ کی ایک چھوٹی سی گٹھری باندھ لی۔ بھولا آیا تو اُس کو اُس نے اپنے مجوزہ سفر کے متعلق بتایا اور اُسکو اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ اندر جا کر بھابھی سے دو روپئے مانگ لائے۔

نارائینی اب تک کھانا تیار کر چکی تھی۔ اور ایک تھال میں سبھی چیزیں سجا رہی تھی۔ اسی دوران

بھولا نے آکر آواز دی ۔۔۔۔ "ماں!"

نارائینی نے منہ پھیر کر بھولا کو دیکھا۔ اور اُس سے کہا ۔۔۔۔ "کیوں کیا ہے؟"

بھولا گائے چرانا، کھیت وغیرہ پر جانا سبھی کام باقاعدہ طور پر کیا کرتا تھا۔ لیکن وُہ رام کے

خوف کے مارے اِس گھر میں قدم بھی نہ رکھتا تھا۔

نارائینی کو اپنی طرف مڑتے دیکھ کر آہستہ سے بولا ۔۔۔ "اِدھر آئیے ماں جی! آپ سے ایک بات کہنا ہے"

نارائینی بیتاب ہو کر اُس کے پاس آئی۔ بھولا نے سمجھایا ۔۔۔ "ماں جی آپ نے کہا تھا۔ وُہ

کام اَب ہو جائیگا۔ صِرف دُو روپئوں کی ضرورت ہے ۔۔۔۔۔"

نارائینی کچھ نہ سمجھ سکی اور پھر بھولا سے پُوچھا ۔۔۔ "کیا کام ہو جائیگا میں نے تجھ سے کیا

کہا تھا اور کس کو یہ روپئے چاہئیں؟"

بھولا نے حیران ہو کر کہا ۔۔۔ "ماں جی! آپ نے ہی تو چھوٹے بابُو کو چلے جانے کیلئے کہا تھا۔ لہٰذا

وُہ جانے کیلئے تیار ہیں آپ اُنہیں دُو روپئے دیدیجئے تاکہ وُہ چلے جائیں۔ یہ زادِ راہ کیلئے درکار ہیں ماں جی!

بڑی بے چین ہو کر نارائینی بولی ۔۔۔ "میں نے کب چھوٹے بابُو کو جانے کیلئے کہا ہے؟ کہاں

جا رہا ہے؟ وُہ ہے کہاں ۔۔۔۔۔؟"

باہر دروازے کے پاس نیم کے نیچے کھڑے ہیں بابا نارکیشور کے پاس کہیں اُن کے ماموں کا مکان

ہے وہیں جائینگے ماں جی! بہت دیر ہو رہی ہے۔ بھلا دُو نہ دیجئے۔ ایک روپیہ ہی دیدیجئے۔"

"تُو جا بھولا! رام کو اندر بُلا لا۔ کہہ دے میں بُلاتی ہُوں ۔۔۔۔۔"

بھولا نارائینی کا حکم پاکر فوراً باہر چلا گیا۔ اور نارائینی پریشان کھڑی رام کی راہ دیکھتی رہی

وُہ یہی سوچتی رہی کہ وُہ کہاں جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی رام کندھے پر چھوٹی سی گٹھڑی لٹکائے سر نیچا کئے ہوئے نارائینی کے

سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ نارائینی بغیر کچھ کہے سُنے چُپ چاپ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باورچی خانے

میں لے گئی اور بیٹھا لے گئی۔

دُور سے رام کو باورچی خانہ میں لیجاتے دیکھ کر دِگبری بہُت حیران ہُوئی اور تیز قدموں سے چلکر باورچی خانہ کے دروازے تک آئی۔ اُس نے جھانک کر دیکھا کہ نارائینی پرُو سے ہُوئے تھال کے سامنے رام گود میں لئے بیٹھی ہے۔ اَور رام اُس کے سینے کے ساتھ لگا ہُوا ہے۔ نارائینی کے آنسو اُس کی پیٹھ پر گر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک دِگبری حیرت سے دیکھتی رہی، پھر دروازے کے اندر قدم رکھتی ہُوئی بولی ——— "اُف اوہ! اِسی لئے اتنا کھانا تیار کیا جا رہا تھا، کھلایا جائے گا اِس جیتے کو میرے داماد نے جو اتنی بڑی قسم کھِلائی تھی، وُہ شاید اُڑ ہی گئی ———"

نارائینی نے سر گھُما کر کہا ——— "نہیں ماں! اُڑ کیوں جائیگی؟ قسم دینے والے کی بات کو میں نے رکھنے کی سعی کی ہے۔ تین دِن ہو گئے، نہ میں نے ہی کھایا ہے نہ اُسے ہی کھانے کو دِیا ہے۔"

اِس بار دِگبری نے بڑے کرخت لہجہ میں کہا ——— "اس طرح سے محبّت سے کھِلا کر معلُوم ہوتا ہے اُس کی قسم کے برعکس کیا جا رہا ہے جس نے قسم کھِلائی ہے اُس سے ایکبار پُوچھ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

نارائینی نے ماں کے حملہ کو بڑے حوصلہ سے برداشت کر کے کہا ——— "میں اجازت لے چکی ہُوں ماں"

دِگبری کو اِس کا اعتبار نہیں آیا۔ وُہ اَور زیادہ غصّہ میں بھر کر بولی ——— "میں کل کی دُودھ پیتی بچّی نہیں ہُوں نارائینی تُو نے اجازت لے لی اَور مجھے پتہ بھی نہ چلا۔"

اِس بار نارائینی سے اَور زیادہ برداشت نہ کیا گیا۔ اُس نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ——— "تُم کیا جانو گی ماں! کہ کِس سے کب مجھے حُکم ملتا ہے۔ پھر جس کا مُنہ ہے وہ قسم بھی دِلا سکتا ہے۔" اِتنا کہہ کر نارائینی نے بڑے پیار سے رام کا سر اُٹھا کر اُس کے گالوں کو تھپتھپایا۔ اور پھر اپنی ماں سے بولی ——— "بیٹے چھاتی سے لگا کر بچّے کی طرح پال پوس کر بڑا کرنا ہوتا ہے، وُہ جانتی ہے کہ اجازت کہاں سے ملتی ہے، آپ کو اِن باتوں کی فِکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی آپ ذرا میرے سامنے سے ہٹ جائیں! میرا یہ بچّہ لگاتار تین دِن سے بھُوکا ہے ذرا آرام سے کھا لینے دیں۔" یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں سے مامتا کے آنسو بہنے لگے۔

دِگبری حیران سی ہو کر تھوڑی دیر تک کھڑی رہی۔ پھر بولی ——— "تب اِس صُورت میں

میرا یہاں رہنا نا ممکن دکھائی دیتا ہے۔ میں صاف طور سے کہے دیتی ہُوں کہ اب میں اِس مکان میں نہ رہ سکوں گی۔"

نارائینی نے فوراً جواب دیا ــــــ "یہی بات میں اِتنے دنوں سے مُنہ کھول کر نہ کہہ سکتی تھی۔ یہ جب بات چھڑی ہے تو پھر میرا بھی یہ کہنا ہے کہ اب آپ کا ہم لوگوں کے ساتھ رہنا نہ ہو سکے گا۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے میرا اِتنا بڑا لڑکا سُوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ لڑکا چاہے شرارتی ہو، یا کسی طرح کا بھی ہو، اپنی آنکھوں کے سامنے میں کسی کو اپنے لڑکے کے پیچھے نہ پڑنے دُونگی۔ آج آپ رہیئے۔ لیکن کل آپ کے جانے کا انتظام ہو جائے گا۔ اور آپ کسی بات کی فکر نہ کریئے۔ روپیہ آپ کا ہر مہینے پہنچتا رہے گا۔ اور آپ کو خرچ کی تکلیف نہ اُٹھانا پڑے گی۔ خیر جس طرح بھی ہو، آپ کسی طرح بھی یہاں نہ رہ سکینگی۔"

دِگمبری کو نارائینی کے مُنہ سے اِس طرح کھری کھری سُننے کی رتّی بھر بھی اُمید نہ تھی۔ اِتنی صاف صاف سُن کر، مانو اُسے کاٹھ مار گیا۔ اور وُہ تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ باہر چلی گئی۔

رام بھی بھابھی کی گود میں بیٹھا سب کچھ سُن رہا تھا۔ دگمبری کے جاتے ہی وُہ بول اُٹھا ــــــ "نہیں بھابھی اُن کو یہاں رہنے دو۔ اب میں ایک اچھا لڑکا بن گیا ہُوں۔ تم اُن کو ایک موقعہ اور دو۔"

نارائینی نے بڑے پیار کے ساتھ اُسے گلے سے لگاتے ہُوئے ہنس کر کہا ــــــ "اچھا اچھا پہلے تو کچھ کھا پی لے۔ ــــــ"



"ایک نوجوان بیوہ — ایک زندہ لاش...

شرت چندر قلوب کی گہرائیوں سے اُبھرنیوالے احساسات کا صحیح ترجمان ہے۔ سرزمین بنگال کے اس مصنف نے قلم کو پڑھنے والے کے جذبات کو جھنجھوڑ دینے میں ملکہ حاصل رہا ہے۔ اس کی ہر کہانی ہمیشہ ہماری اور آپ کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

"بڑی دیدی" میں شرت چندر کے قلم نے خود بھی خون کے آنسو روئے ہیں اور دوسروں کو بھی رُلائے ہیں۔ یہ ایک ایسی نوجوان بیوہ کی کہانی ہے۔ جسے ایک سادہ لوح نوجوان سے عشق ہو گیا تھا۔ [illegible] وہ اسے ایک دیوی کی طرح پوجتا تھا۔ کردار [illegible] کردار کے تضاد کی یہ شدید ترین جذباتی جنگ [illegible] ناول میں اتنے مؤثر پیرائے میں تحریر کی گئی ہے کہ مدت تک اس کے نقوش پڑھنے والے کے ذہن [illegible] رہتے ہیں۔

POCKET BOOK 13

1/- قیمت کی کتاب